تیسری کتاب امراؤ جان ادا اردو کے بہترین ناولوں اور ادبیات کی کلاسیکل کتابوں میں ہے، زبان وبیان کی لطافت ودلکشی اور کردار و پلاٹ کی خوبی و دلآویزی میں بھی بے نظیر ہے،

چوتھی کتاب فسانۂ مبتلا المعروف بہ محصنات اردو کے مشہور صاحب طرز ادیب اور پہلے ناول نگار مولانا نذیر احمد دہلوی کی ہے، جو ان کے ناولوں کی خصوصیات اور مخصوص طرز نگارش کی رعنائی و دلکشی کی حامل ہے، آخری کتاب اردو شاعری کے باوا آدم ولی گجراتی کی غزلیات اور بعض دوسرے اصناف کلام کا انتخاب ہے،

لائق مرتبین کے قلم سے ہر کتاب کے شروع میں ایک جامع اور پرمغز تعارف بھی شامل ہے، اس میں کتاب کے خصوصیات اور مصنف کے کمالات کا بڑے سنجیدہ اور معتدل انداز میں ذکر ہے، خصوصاً پہلی دونوں کتابوں کا تعارف جو رشید حسن خاں صاحب کے متوازن اور مدلل قلم سے ہے ان کی دیدہ وری، ادبی بصیرت شائستگی تحریر اور رائے کے اعتدال و توازن کا نمونہ ہے، آخری تین کتابوں کے آخر میں فرہنگ بھی ہے، اگر لائق مرتبین حواشی بھی تحریر کر دیے ہوتے تو ہر کتاب کی قدر و قیمت دوچند ہو جاتی، اردو زبان و ادب کے طلبہ کے لیے ان کلاسیکل کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، مکتبہ جامعہ ان کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے،

فضائل درود ابراہیمی ۔ مرتبہ مولانا محمد راشد اعظمی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۴ قیمت ۵۰ پیسے، پتہ مکتبہ اسلامی ادب، فاطمان، وارانسی

اس کتابچہ میں درود شریف کی اہمیت و فضیلت کا ذکر اور درود ابراہیمی کے متعلق بعض شکوک کا جواب دیا گیا ہے، آخر میں مختلف ماثورہ درود کے الفاظ و معانی درج کیے گئے ہیں، درود شریف شفاعت نبوی کا وسیلہ ہے، اس لیے اس رسالہ کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب ہوگا۔ "ض"

جلد ۱۰۹۔ ماہ محرم الحرام ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۲ء۔ عدد ۳

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

اسلامی کانفرنس نے بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان صلح کرانے کے لیے جو قدم بڑھایا ہے وہ بہت ضروری تھا، یہ کام اسی کے کرنے کا تھا، بنگلہ دیش آزاد ہو چکا، اب دونوں میں سیاسی وحدت کا تو کوئی سوال نہیں، مگر اسکے علاوہ بھی اُن میں صلح و صفائی کی بڑی ضرورت ہے، دونوں کے درمیان بہت سے مختلف فیہ مسائل ہیں، جن کے حل کے بغیر دونوں میں کسی قسم کے تعلقات نہیں ہو سکتے، بنگلہ دیش کو پاکستان سے جو شکایتیں بھی ہوں، مگر اب اس نے بھی صلح کا ہاتھ بڑھایا ہے اس لیے بنگلہ دیش والوں کو جذبات سے کام لینے کے بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے، مذہبی رشتہ سے قطع نظر جس کی اب کوئی قیمت نہیں رہ گئی ہے، دونوں ایشیائی اور پڑوسی ملک ہیں، اُن کے بہت سے مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اس لیے وہ ہمیشہ کے لیے بے تعلق نہیں رہ سکتے،

بنگلہ دیش کی حکومت خواہ کتنی ہی سیکولر ہو اور وہاں کے برسر اقتدار لوگوں کے جو خیالات بھی ہوں لیکن بنگالی قوم بہرحال مسلمان اور بنگلہ دیش مسلمان ملک ہے، اور اس کو دنیائے اسلام سے تعلقات رکھنا ہیں، اس سلسلہ میں یہ بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ مختلف تاریخی جغرافی اور تمدنی عوامل کی بنا پر مغربی پاکستان کا خطہ بنگلہ دیش کے مقابلہ میں ہمیشہ سے اسلامی ملکوں سے زیادہ قریب رہا ہے اور اسکی آواز ان میں زیادہ موثر رہی ہے، اب بنگلہ دیش کو ان میں نہ صرف اپنی جگہ بنانا ہے بلکہ مغربی پاکستان کا توڑ بھی کرنا ہے اسلئے اسکو اسلامی کانفرنس کی تجویز کا خیر مقدم کرنا چاہیے، یہ چیز سیکولرزم کے خلاف نہیں ہے،

دو چار کے سوا قریب قریب سارے اسلامی ملک سیکولر اور جمہوری ہیں، مگر وہ سب اسلامی اتحاد کے حامی اور اسکی تنظیموں میں شریک ہیں، ٹرکی بھی جو سیکولرزم کا امام ہے، ان کا رکن ہے اس لیے بنگلہ دیش کا قدم بھی کسی سے پیچھے نہ رہنا چاہیے، ورنہ وہ اسلامی دنیا سے کٹ کر رہ جائے گا،

مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ کچھ دنوں سے سرد پڑ گیا تھا، حکومت کے ذمہ داروں نے بارہا اسکا یقین دلایا کہ مسلمانوں کی مرضی کے بغیر اس میں تبدیلی نہ کیجائیگی، مگر اب کچھ نام نہاد مسلمانوں نے اسکا مطالبہ شروع کر دیا ہے، اس مسئلہ کو سمجھنے میں بنیادی غلطی یہ کیجاتی ہے کہ اس کو مذہبی نہیں بلکہ سماجی مسئلہ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ مسلمانوں کا پرسنل لا کلام مجید اور احادیث نبوی پر مبنی ہے، جو مسلمان اس کا مطالبہ کرتے ہیں اُن میں سے کچھ تو حسن نیت سے مگر مذہب سے ناواقفیت کی بنا پر کرتے ہیں، اور کچھ وہ لوگ ہیں جنکو مذہب سے کوئی علاقہ نہیں، وہ کلام مجید کے صریح احکام کو بھی قابل ترمیم سمجھتے ہیں، اور علانیہ اسکا اظہار کرتے ہیں، ایسے لوگ مسلمان کہلانے کے کب مستحق ہیں، اور ان کو مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کا کیا حق ہے، محض مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے اور مسلمانوں جیسا نام رکھ لینے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک کلام مجید کے احکام پر پورا ایمان نہ ہو۔

پرسنل لا کے منصوص اور صریح احکام میں تو کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن مصلحت اور ضرورت کے لحاظ سے بعض پہلوؤں میں ترمیم و اصلاح کی گنجایش ہے، مگر مصلحت و ضرورت کا معیار محض زمانہ کا رجحان اور دوسروں کی تقلید نہیں، بلکہ واقعی ضرورت ہے، جس کے بغیر مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو، اس صورت میں بھی اس کا اختیار ماہرین شریعت کو ہے، ہر کس و ناکس کو نہیں کہ وہ شریعت کے دائرے کے اندر اس کے اصولوں کی روشنی میں اس کا حل نکالیں، اگر زمانہ

کے رجحان و مذاق کو معیار مان لیا جائے تو وہ ہر زمانہ میں بدلتا رہتا ہے، اس لیے ہر دور کے مذاق کے مطابق شریعت کے قوانین میں تبدیلی کرنا پڑے گی، اور وہ بازیچۂ اطفال بن جائے گی،

یہ مسرت کا مقام ہے کہ دار العلوم دیو بند نے اس مسئلہ کی طرف توجہ کی ہے، اور مولانا محمد طیب صاحب نے اس پر غور کرنے کیلئے علماء کا ایک اجتماع طلب کیا ہے، اس قسم کے مسائل پر غور اور انکے متعلق فیصلہ کا سب سے زیادہ حق دار العلوم دیو بند ہی کو ہے، امید ہے کہ مولانا محمد طیب صاحب کی رہنمائی میں یہ ضروری کام صحیح طریقہ سے انجام پائیگا، پرسنل لا کے بعض فقہی مسائل ہیں اگر کسی خاص مکتب فقہ کی پابندی نہ کیجائے تو بہت سی مشکلات کا حل نکل سکتا ہے، اور ہر دور کے فقہاء نے ضرورت کے وقت اس سے فائدہ اٹھایا ہے، اس لیے اس زمانہ میں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ناظرین کو یہ معلوم کر کے افسوس ہو گا کہ دفتر دار المصنفین کے منصرم یحییٰ صاحب اعظمی نے چند دنوں کی علالت کے بعد ۲۳ فروری کو انتقال کیا، وہ عمر بھر دار المصنفین سے وابستہ رہے اور مرکر اس سے جدا ہوئے، مرحوم بڑے متدین اور دفتری کاموں میں تجربہ کار تھے، ہزاروں روپیے کا کاروبار اُن کے ہاتھ میں تھا اور کبھی ایک حبہ کا فرق نہیں نکلتا تھا، ایسے قابل اعتماد آدمی مشکل سے ملیں گے، طبیعت میں حد سے زیادہ نظافت و نفاست تھی، بڑی صاف ستھری زندگی بسر کرتے تھے، ان کا دفتری کام بھی بڑا صاف ستھرا تھا، خشک دفتری کاموں کے ساتھ خوشگو شاعر بھی تھے، اُن کے کلام کے دو مجموعے "نوائے حیات" اور "نوائے عصر" شائع ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

تہذیب کی تشکیل جدید

جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(سلسلہ کیلئے ملاحظہ ہو معارف مئی ۱۹۶۹ء)

اس مفید مضمون کے کئی نمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکے ہیں، مولانا کی مشغولیت کی وجہ سے درمیان میں عرصہ تک اس کا سلسلہ رک گیا تھا، اب انھوں نے پھر اس کو شروع کیا ہے، مضمون کی افادیت کے پیش نظر اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

دوسری قسم (جن صفات کا زیادہ تعلق دوسرے انسانوں کی فلاح و بہبود سے ہے) کی تفصیل یہ ہے:-

عدل و عدالت | اللہ کی صفت "عدل و عدالت" کائنات کے ہر گوشہ میں نمایاں اور اسی پر کائنات کا پورا نظام قائم ہے، صفات امتیازی میں یہ صفت زندگی کی روح رواں اور قیام و بقا کی بنیاد ہے، اس کے بغیر نہ شخصی کردار میں توازن پیدا ہوتا اور نہ جماعتی کردار قیام و بقا کی ضمانت پیش کرتا ہے،

لغت میں عدل کے معنی کسی چیز کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا،

العدل هو التقسيط على سواء[1] — عدل کے معنی برابر تقسیم کرنا

[1] راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن

قرآن حکیم میں اس کے لیے لفظ میزان آیا ہے | قرآن حکیم میں اس کی حقیقت کو لفظ میزان (ترازو) سے سمجھایا گیا ہے کہ اگر کسی ایک طرف پلہ جھک جائے تو پورا نظام درہم برہم ہو جائے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ	اللہ نے آسمان کو بلند کیا اور (قانون
الْمِيزَانَ (رحمٰن۔ رکوع ۱)	عدالت کا) میزان رکھا۔

دوسری جگہ ہے

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ	ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل دے کر
وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ	بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ	اتاری تاکہ وہ لوگوں میں انصاف
(حدید۔ رکوع ۳)	قائم کریں۔

امام غزالی، افلاطون اور دیگر فلسفیوں کے نزدیک عدل کی تعریف | امام غزالیؒ نے عدل کی یہ تعریف کی ہے:۔

هو ضبط الشهوة والغضب	قوت شہوت و غضب کو اس حد تک
تحت اشارة العقل والشرع	ضبط کرنا کہ وہ عقل و شرع کے مطابق
(احیاء العلوم ج ۳ ص ۴۸)	کام کرنے لگیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے یہ تعریف کی ہے:۔

هي ملكة في النفس تصدر عنها	عدالت ایک ملکہ ہے جس سے وہ
الافعال التي يقام بها نظام	افعال صادر ہوتے ہیں جن سے بآسانی
المدينة والحي بسهولة (حجۃ اللہ البالغہ)[ص۹۵]	شہر اور گاؤں کا انتظام ہوتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک عدالت کا جوہر "روحانی و داخلی" ہے، یعنی اندرونی زندگی اتنی منظم ہو کہ ہر شخص اپنا کام کرے اور دوسرے کے کام میں دخل نہ دے۔ اسی طرح "جان ڈیوی جیمس"

اور روجرس وغیرہ کے نزدیک عدالت اخلاق کا ماحصل اور فضائلِ اصلیہ کی سرتاج ہے، اگر یہ نہ ہو تو دوسرے فضائل اپنی غرض و غایت کھو بیٹھیں گے۔[۱]

مغربی تہذیب میں عدل کی بنیاد | مغربی تہذیب میں عدل و عدالت کی بنیاد قوم پرستی و وطن پرستی ہے، جس کو قومی ترقی و سربلندی کے لیے قومی پیمانہ پر اپنایا جاتا ہے،

تشکیل جدید میں عدل کی بنیاد | تشکیل جدید میں اس کی بنیاد خدا پرستی و روحانی پاکیزگی پر ہے جو عالمگیر افادیت و عمومی رحمت کے اس نظریے کے تحت وجود میں آتا ہے،

الخلق كلهم عيال الله[۲]	تمام مخلوق اللہ کی عیال ہیں۔

دوسری جگہ ہے:

الناس كلهم اخوة (الحدیث)	تمام لوگ بھائی بھائی ہیں

عدل کا معیار | اس لحاظ سے عدل و عدالت کا معیار نہایت بلند ہے، جس کی نظر میں قریب و بعید، دوست و دشمن، اپنے اور غیر میں کوئی امتیاز نہیں ہے،

قرآن حکیم میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ	اے ایمان والو مضبوطی کے ساتھ انصاف
بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ	پر قائم رہنے والے اور خدا لگتی گواہی دینے والے
أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ	ہو جاؤ، اگرچہ یہ گواہی اپنے نفس یا ماں باپ
إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ	اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو،
أَوْلَىٰ بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ	اگر ان میں کوئی مالدار یا محتاج ہے (تو تمہیں
أَن تَعْدِلُوا (نساء، رکوع ۲۰)	اس کی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے)

اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے کہ تم انصاف چھوڑ دیں [illegible]

---

[۱] روجرس، تاریخ اخلاقیات ص ۳۳ و جان ڈیوی و جیمس، ریخ النفس اخلاقیات حصہ ۲ باب ۱۹ ص ۳۳۴ [۲] مشکوۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق الفس[؟]

دوسری جگہ ارشاد ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ (مائدہ - رکوع ۲)

اے ایمان والو مضبوطی کے ساتھ انصاف پر قائم رہنے والے اور خدا لگتی گواہی دینے والے ہو جاؤ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ آمادہ کردے کہ اسکے ساتھ بے انصافی کرو ہر حال میں انصاف کرو یہی تقویٰ سے لگتی بات ہے اور اللہ سے ڈرتے ہو۔

قبیلہ مخزومیہ کی ایک مالدار عورت نے چوری کی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کی سفارش پہنچائی گئی تو آپ نے فرمایا:

إنما اهلك الذين قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه واذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحد، وايم الله لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها[1]

تم سے پہلے لوگ اس بنا پر ہلاک کیے گئے کہ اگر ان میں کوئی اونچے درجہ کا شخص چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا اور اگر کمزور شخص چوری کرتا تو اس پر حد جاری کی جاتی، خدا کی قسم اگر فاطمہ میری بیٹی بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

عدل و عدالت کی دو قسمیں ہیں:-

(۱) شخصی اور (۲) جماعتی

شخصی عدل

شخصی عدل یہ ہے کہ حقوق و فرائض کی ادائیگی میں ہم آہنگی برقرار رہے، قرآن حکیم کے مختلف مقامات میں اس کا ذکر ہے۔

[1] بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب الشفاعۃ فی الحدود

یتیموں کے بارے میں ہے:-

وَأَن تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ (نساء ۱۹)

اور یتیموں کے حق میں انصاف ملحوظ رکھو،

عورتوں کے بارے میں ہے:-

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (نساء - ۱۹)

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کرسکوگے تو ایک ہی عورت سے شادی کرو۔

شہادت و فیصلہ اور باہمی تصفیہ کے بارے میں ہے:-

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ (الانعام - ۱۹)

جب بات کہو تو انصاف کے ساتھ کہو اگرچہ (فریق) رشتہ دار ہی ہو۔

دوسری جگہ ہے:-

فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا (حجرات - ۱)

دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرو اور انصاف کرو

خرید و فروخت اور دیگر معاملات کے بارے میں ہے:

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ (الانعام - ۹)

انصاف کے ساتھ ناپ اور تول کرو

دوسری جگہ ہے:-

وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (بقرہ - ۳۹)

چاہئے کہ معاملات میں باہمی قرارداد کو کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے۔

ایک اور جگہ ہے:-

فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ (بقرہ ۳۹)

اس کا ولی (مختار کار) انصاف کیساتھ لکھائے

جماعتی عدل جماعتی عدل یہ ہے کہ اس کے نظم و قوانین میں ہر شئی اور ہر شخص کی رعایت رکھی گئی ہو یعنی ہر شئی اپنے محل اور اپنی حدود کے اندر رہے، اور ہر شخص کو اس کی استعداد کے مطابق یکساں مواقع حاصل ہوں،

یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ فکری و عملی قوتوں میں توازن برقرار رہے، اور عدل قائم کرنے میں ہر شخص اللہ کو حاضر و ناظر جان کر اپنی ڈیوٹی انجام دے۔

قرآن حکیم میں ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (نساء - ۸)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں انکے اہل کو پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

اس آیت میں اصل خطاب حاکموں سے ہے اور امانت میں ہر قسم کی ذمہ داریاں، عہدے اور مناصب وغیرہ شامل ہیں،

ان هذا الخطاب لولاة الامر ان يقوموا برعاية الرعاية وحملهم على موجب الدين والشريعة وعدوا من ذلك تولية المناصب مستحقيها[1]

یہ خطاب حاکموں سے ہے کہ وہ رعایا کی حفاظت کریں، ان کو دین و شریعت کے مطالبات کا پابند بنائیں، امانت کی ادائیگی میں یہ بات بھی شامل ہو کہ عہدے اور مناصب انکے مستحقین کو دیے جائیں،

ابن تیمیہ کہتے ہیں:

[1] شفیع دیوبندی: مقالہ دستور قرآنی۔

وهو كان سبب نزول الآية[1]

حاکم ہی اس آیت کے نزول کا سبب ہیں

قرآن میں ہے

وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (شوریٰ - ۲)

آپ کہدیجئے کہ میں اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں،

ایک اور جگہ ہے

وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (المائدہ - ۶)

اگر آپ فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجئے، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

عدل و عدالت کی ضد ظلم ہے عدل و عدالت کی ضد ظلم ہے، خواہ شخصی زندگی میں پایا جائے یا جماعتی زندگی میں، اس کا خاصہ ہلاکت و بربادی ہے۔

لغت میں ظلم کے معنی ہیں:

وضع الشئ في غير موضعه المختص به[2]

کسی شے کو اس کی غیر جگہ میں رکھنا۔

قرآن حکیم میں ظلم کے مفہوم کی وسعت قرآن حکیم میں اس کا استعمال کئی معنوں میں آیا ہے (کفر، شرک، معصیت، حق تلفی اور ایک دوسرے پر زیادتی وغیرہ) اور ان سب میں لغوی معنی کا لحاظ ہے، کفر کے بارے میں ہے:

فمن اظلم ممن كذب على الله

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے

[1] ابن تیمیہ، الجوامع فی السیاسۃ الالٰہیۃ [2]

وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ط اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ (زمر. رکوع ۴)

اللہ پر جھوٹ بولا اور سچی بات کو جھٹلایا جب اس کے پاس آئی، کیا کافروں کا ٹھکانا دوزخ نہیں ہے۔

دوسری جگہ ہے

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (الاعراف - ۴)

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے،

شرک کے بارے میں ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے

معصیت کے بارے میں ہے:-

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ (فاطر - ۴)

پھر ان میں کوئی (گناہ کرکے) اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔

اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (بقرہ - ۲۹)

جبکہ انھوں نے (گناہ کرکے) اپنے اوپر ظلم کیا،

مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ

جو ایسا کرے گا بیشک وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔

حق تلفی و زیادتی کے بارے میں ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ (الاعراف - ۴)

آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے حرام کیا بےحیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ہوئی اور گناہ و ناحق زیادتی کو حرام کیا

دوسری جگہ ہے:

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (شوریٰ - ۴)

الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ناحق ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی پھیلاتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سی آیتوں میں ظلم کی برائی اور ظالم و مظلوم کے احکام بیان ہوئے ہیں،

احادیث میں ظلم کی برائی | ذیل میں چند حدیثیں ذکر کیجاتی ہیں، جن سے تشکیل جدید میں ظلم کی برائی ظاہر ہوتی ہے، رسول اللہ صؐ نے فرمایا کہ

الظلم ظلمات یوم القیمة[1]

ظلم قیامت کے دن ظلمات بنجائے گا

ایک مرتبہ مقام حجر (ثمود یعنی قوم صالح کی تباہ شدہ بستی) سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گذرے تو فرمایا

لا تدخلوا مساکن الذین ظلموا انفسهم الا ان تکونوا باکین ان یصیبکم ما اصابهم ثم قنع راسه و اسرع السیر حتی اجتاز الوادی[2]

جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے جب انکے گھروں میں داخل ہو تو روتے ہوئے داخل ہو کہ مبادا وہی عذاب تمھیں پہنچے جو انکو پہنچ چکا ہے، پھر رسول اللہ صؐ نے اپنا سر جھکایا اور تیزی کے ساتھ وادی سے گذر گئے،

ایک موقع پر فرمایا

"تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی تو مدد کیجا سکتی ہے مگر ظالم کی مدد کس طرح کیجائے، تو آپ نے فرمایا کہ

---

[1] بخاری و مسلم و مشکوٰۃ باب الظلم [2] ایضاً

اس کو ظلم سے روکا جائے۔" (مسلم باب نصر الاخ ظالماً او مظلوماً)

ایک موقع پر آپ نے حاضرین سے سوال کیا کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس روپیہ پیسہ اور مال و دولت کچھ نہ ہو، اس کے جواب میں رسول اللہ صلعم نے ظلم کی مختلف شکلوں کو ذکر کر کے فرمایا

ان المفلس من امتی من یاتی یوم القیمة بصلوٰة وصیام وزکوٰة ویاتی قد شتم ھذا وقذف ھذا واکل مال ھذا وسفك دم ھذا وضرب ھذا فیعطی ھذا من حسناته وھذا من حسناته فان فنیت حسناته قبل ان یقضی ما علیه اخذ من خطایاھم فطرحت علیه ثم طرح فی النار (مسلم و مشکوٰۃ باب الظلم)

میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے پاس نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ سب نیکیاں ہوں گی لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی کو تہمت لگائی ہوگی کسی کا مال کھایا ہوگا کسی کی خونریزی کی ہوگی کسی کو مارا ہوگا، ان سب کو اسکی نیکیاں دیدی جائیں گی، اگر ان کے حقوق کی ادائیگی سے پہلے نیکیاں ختم ہوجائیں گی تو ان لوگوں کی برائیاں اس پر ڈال دیجائیں گی، پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائیگا۔

رحم

اللہ کی صفتوں میں سب سے بڑی صفت "رحم" ہے، قرآن حکیم میں ہے:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (اعراف-۱۹) — میری رحمت ہر چیز کو وسیع ہے

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (مومن-۱) — اے ہمارے پروردگار آپ کا علم اور آپ کی رحمت ہر چیز کو وسیع ہے۔

اَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ (مومنون-۷) — آپ رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتوں میں بھی "رحم" کو سب سے بڑی صفت قرار دیا گیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء-۷) — نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام جہان کے لوگوں پر رحمت بنا کر۔

دوسری جگہ ہے:-

بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (توبہ-۱۶) — آپ ایمان والوں پر نہایت شفقت اور رحم کرنے والے ہیں

صحابۂ کرام کی صفت میں مذکور ہے:-

رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (فتح-۴) — وہ آپس میں رحم دل ہیں

انسانیت کے لیے رحم کے بغیر چارہ نہیں ہے

انسانیت کے نشوونما کے لیے "رحم" کے بغیر چارہ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لاتنزع الرحمة الا من شقی[1] — رحمت (رحم) بدبخت ہی سے زائل ہوتی ہے۔

تشکیل جدید میں رحم کی اہمیت و تاکید سے متعلق چند روایتیں یہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

الرحم شجنة من الرحمٰن[2] — رحم رحمٰن سے لپٹی ہوئی شاخ ہے۔

من لا یرحم لا یرحم[3] — جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء[4] — تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والے تم پر رحم کریں گے۔

---

[1] ترمذی و مشکوٰۃ باب الشفقة والرحمة علی الخلق الفصل الثانی [2] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصله الله
[3] ایضاً باب رحمة الناس والبهائم [4] بخاری ابواب البر والصلة

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا[۱] — وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جس نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کیا اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کی۔

رحم کی تعلیم انسان تک محدود نہیں بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا

فی کل ذات کبد رطبة اجر[۲] — ہر جانور کے ساتھ رحم کرنے میں اجر ہے

ایک اور جگہ فرمایا

"اگر کوئی شخص ذبح کیے ہوئے جانور پر رحم کریگا تو قیامت کے دن اللہ تعالی اس پر رحم کریگا"[۳]

بے رحمی پر نکیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے رحمی، سنگ دلی، اور قساوت قلبی پر مختلف انداز سے نکیر فرمائی ہے، مثلاً ایک بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو پیار کرتے اور ان کا بوسہ لیتے ہیں، ہم لوگ بوسہ نہیں لیتے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ نے تمھارے دل سے رحم نکال لیا تو میں کیا کر سکتا ہوں،[۴]

اسی طرح جانوروں کے لڑانے کے جو بے رحمانہ طریقے پہلے رائج تھے اور اب بھی رائج ہیں، اس سے آپ نے منع فرمایا۔[۵]

رحم اور عدل کی صفتیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ نیک و بد، ظالم و مظلوم، باغی و وفادار، متقی و فاجر کے درمیان عدل کیا جائے، بلکہ ان کے ساتھ یکساں سلوک رحم کے منافی ہے،

---

[۱] ترمذی و مشکوٰۃ، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق الفصل الثانی [۲] بخاری و مسلم [۳] بخاری الادب المفرد باب رحمۃ البہائم [۴] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ المولود [۵] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم

احسان احسان۔ دوسرے کے ساتھ ایسا سلوک کرنا کہ جس سے اس کا دل خوش ہو اور اسکو راحت ملے،

قرآن حکیم میں اللہ تعالی کی صفت "محسن" بار بار ذکر کی گئی ہے، نیز اس کے احسانات کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا اور بندوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ اس آیت میں حکم ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل۔ رکوع ۱۳) — اللہ انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے

عدل کے ذریعہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق ملتا اور "احسان" کے ذریعہ لوگوں کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کا خیال رکھا جاتا ہے، یعنی بات صرف عدل پر نہیں ختم ہوتی، بلکہ راحت و آرام پہنچانے کے لیے احسان و سلوک کا بھی حکم ہے

احسان کی مختلف شکلیں قرآن حکیم نے احسان کی مختلف شکلیں بیان کی ہیں، مثلاً مالی امداد کرنا

اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ (قصص۔ ۸) — احسان کر (قارون کو حکم ہے) جیسا کہ اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا۔

مصیبت سے نجات دلانا

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ (یوسف۔ ۱۱) — اللہ نے مجھ پر احسان کیا (یوسف کا قول) کہ اس نے مجھکو قید خانہ سے نکالا۔

قصور معاف کر دینا وغیرہ

وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (آل عمران۔ ۱۴) — اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں "احسان" کے لیے اور الفاظ بھی مستعمل ہیں، مثلاً "فضل"، "عرف"، "معروف" اور "بر" وغیرہ، ان سب کے مجموعی مواقع استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ احسان کسی خاص شکل میں

محدود نہیں، بلکہ اس کا دائرہ نیکی کی تمام راہوں کو وسیع ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"اللہ نے ہر شے کے ساتھ احسان کرنا فرض کیا ہے، حتیٰ کہ اگر کسی کو جان سے مارنے کی نوبت آئے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو خوبی کے ساتھ ذبح کرو، چھری کو تیز کر لو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔" (مسلم کتاب الصید والذبائح)

صرف احسان کے بدلہ میں احسان کا حکم نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی بدسلوکی سے پیش آئے تو اس کے ساتھ بھی احسان کی تاکید ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (رحمٰن-۳) — احسان کا بدلہ احسان ہی ہے

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں کسی شخص کے پاس سے گذرتا ہوں تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا، اگر وہ میرے پاس سے گذرے تو کیا میں بھی اس کی مہمانی نہ کروں؟ آپ نے فرمایا نہیں، تم اس کی مہمانی کرو۔ (ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو)

عفو و درگذر

عفو و درگذر بھی اللہ تعالیٰ کی نہایت اہم اور بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہو تو گناہوں سے بھری دنیا تباہ و برباد ہو جائے، اللہ کے نام غافر، غفور اور غفار بار بار آتے ہیں، اور عفو و معافی کا بھی ذکر متعدد جگہوں پر آیا ہے، مومن بندوں کی صفت میں ہے:

وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ (شوریٰ-۴) — جب وہ غصہ ہوتے ہیں تو معاف کرتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے:

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (نور-۳)

اور چاہیے کہ وہ لوگوں کو معاف کر دیں اور درگذر سے کام لیں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں معاف کرے، اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے

کلام مجید میں ان موقعوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے، جہاں عفو و درگذر کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، مثلاً

عفو و درگذر کے اہم مواقع

مذہب کے معاملہ میں لوگوں کے احساسات نہایت نازک ہوتے ہیں، اس میں اختلاف و اشتعال انگیزی کی صورت میں عفو و درگذر کا حکم ہے

فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ (بقرہ۔ رکوع ۱۳) — معاف کرو اور درگذر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم صادر فرمائے۔

جب انسان کی عزت و آبرو پر حملہ ہوتا ہے تو وہ بے قابو ہو جاتا ہے، اس حالت میں بھی عفو و درگذر کا حکم ہے

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا (نور۔۳)

تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب حیثیت ہیں وہ قرابت داروں، محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (امداد) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں بلکہ چاہیے کہ انکے قصور بخشدیں اور درگذر کریں۔

حضرت مسطحؓ حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے، وہ ان کی کفالت کرتے تھے، لیکن جب انھوں نے واقعۂ افک میں حصہ لیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی مالی امداد بند کر دی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ میں اپنے خادم کا قصور کتنی مرتبہ معاف کروں؟ آپ کچھ دیر خاموش رہے، اس نے پھر سوال کیا، آپ نے فرمایا ہر روز ستر دفعہ معاف کیا کرو۔ (ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی ادب الخادم)

اس حدیث میں تعداد مقصود نہیں، بلکہ عرب کے محاورہ کے مطابق کثرت بیان کرنا مقصود ہے۔

عفو و درگزر کی تعلیم میں خودداری کی شان برقرار رہتی ہے

موجودہ انجیل میں عفو و درگزر کی تعلیم جس انداز سے دی گئی ہے، اس سے طبیعت میں ذلت اور پستی پیدا ہوتی ہے، لیکن تشکیل جدید میں جس انداز میں اس کی تعلیم ہے، اس سے نہ خودداری کو ٹھیس پہنچتی اور نہ نظم و انتظام میں خلل واقع ہوتا ہے، چنانچہ ظلم و زیادتی کی صورت میں بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے لیکن عفو و درگزر اللہ کی نگاہ میں زیادہ پسندیدہ ہے،

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا
فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ
إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ
(شوریٰ - ۴)

اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، لیکن جو شخص معاف کرے اور صلح کرلے تو اسکا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، بیشک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

بدلہ کا حق حاصل ہونے کے بعد عفو و درگزر سے کام لینا بڑی ہمت کا کام اور بلند اخلاق کی اعلیٰ مثال ہے،

ایثار و قربانی

یعنی اپنی ذاتی ضرورت پر دوسروں کی ضرورتوں کو ترجیح دینا، صمدیت (بے نیازی) اللہ کی صفت ہے، یہ اس کا عکس ہے، اس وصف سے انسانیت کے جوہر نمودار ہوتے اور انسان اعلیٰ مدارج طے کرتا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے،

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا
مِمَّا تُحِبُّونَ (آل عمران - ۱۰)

تم کمال نیکی نہیں حاصل نہیں کرسکتے یہاں تک اپنی پسندیدہ چیزیں خرچ کرو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ وصف بہت نمایاں تھا، جس کی بکثرت مثالیں محفوظ ہیں۔

انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف

صحابۂ کرام میں انصار کا سب سے بڑا وصف یہی تھا جس کی بدولت اسلام کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اور مدینہ پہنچنے کے بعد اس کا دائرہ روز بروز وسیع ہونے لگا، انصار کے اس وصف کا تذکرہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں ہے:-

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ
مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ
إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ
حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ
أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ
وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ
(حشر، رکوع ۱)

اور ان کے واسطے جنھوں نے ان (مہاجرین کی آمد) سے پہلے اس دار (مدینہ) اور ایمان میں جگہ پکڑ لی یہ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں جو وطن چھوڑ کر ان کے پاس آئے اور اپنے دل میں تنگی نہیں محسوس کرتے اس سے جو ان کو دیا جائے اور اپنے اوپر ان کو مقدم رکھتے ہیں اگرچہ فاقہ کی نوبت آجائے اور جو اپنی طبیعت کے لالچ سے بچالیے گئے وہی مراد پانے والے ہیں،

ایک مرتبہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، کاشانۂ نبوت میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا، آپ نے فرمایا جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے گا، یہ سنکر ایک انصاری اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ اس نے جواب دیا صرف بچوں کا کھانا ہے، انصاری نے کہا کہ بچوں کو بہلا کر سلا دو اور مہمان کو کھانا دے کر چراغ بجھا دو، تاکہ اسکو یہ پتہ نہ چل سکے کہ ہم لوگ کھانا نہیں کھا رہے ہیں، چنانچہ بیوی نے ایسا ہی کیا، انصاری صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ تمھارے اس

حسن سلوک سے اللہ بہت خوش ہوا۔ (مسلم کتاب الاشربہ باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ)

بحرین جب فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصاریوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں، ان لوگوں نے عرض کیا کہ جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ ملے ہمیں یہ لینا منظور نہیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو، میرے بعد تمہیں یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے اور تمہیں نہ پوچھیں گے۔[۲] (بخاری جلد ۱ باب مناقب الانصار)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان صفات سے کس قسم کے محاسن کی نمود ہوتی ہے۔

صفات تعمیری سے پیدا شدہ صفات تعمیری صفات سے درج ذیل قسم کے صفات نمودار ہوتے ہیں مثلاً

غلبہ و اقتدار اس سے برتری، اقتدار و بالادستی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس کی تسکین کیلیے انسان جدوجہد پر مجبور رہوتا ہے، یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی صفات الملک العزیز اور القاہر کا عکس ہیں جن کا پرتو قرآن حکیم میں ہے،

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ (آل عمران - ۳)	کہیے اے اللہ، ملک کے مالک آپ جسکو چاہیں ملک بخشدیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیں، جسے چاہیں عزت دیں اور جسے چاہیں ذلیل کر دیں، آپ ہی کے ہاتھ میں ہر طرح کی بھلائی کا سررشتہ ہے۔

دوسری جگہ ہے،

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (انعام - ۲)	وہی اپنے بندوں پر زور اور غلبہ رکھنے والا ہے اور وہی حکمت والا اور آگاہ ہے،

رعب و دبدبہ اس سے خود رائی و خودنمائی کا احساس ابھرتا ہے جس کو بروئے کار لانے کے لیے انسان طرح طرح کی تدبیریں کرتا ہے، یہ جذبات اللہ تعالیٰ کی صفت الکبیر المتعال، المتکبر وغیرہ کا عکس ہیں، قرآن حکیم میں ہے:

وَلَهُ الْكِبْرِيَاۗءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (الجاثیہ - ۴)	اور اللہ ہی کے لیے بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست حکمت والا ہے

دوسری جگہ ہے:-

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (المومن - ۲)	آج کس کا راج ہے اللہ کا ہے جو اکیلا اور غلبہ والا ہے۔

جلال و جبروت اس سے شخصیت پر ہیبت بنتی ہے، اور دوسروں کی دست اندازی سے حفاظت رہتی ہے، یہ جلال و جبروت اللہ تعالیٰ کی صفات الجبار اور ذوالجلال کا عکس ہے، قرآن کریم میں ہے

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن - ۳)	آپ کے رب کا نام بڑی برکت والا ہے عظمت اور بڑائی والا ہے

دوسری جگہ ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن - ۲)	جو کوئی زمین پر ہے وہ فنا ہونے والا ہے، اور آپ کے رب کی ذات باقی رہے گی جو عظمت و بڑائی والی ہے۔

محنت کوشی و سخت گیری اس سے انسان میں محنت و مشقت کا جذبہ ابھرتا اور وہ عزم و ہمت کے کام پر آمادہ ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے اوصاف القوی المتین اور ذی الطول کا عکس ہے،

قرآن حکیم میں ہے :-

ذِی الطَّوْلِ (المؤمن، رکوع ۱) — اللہ قدرت والا ہے

اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (بروج-۱) — بیشک آپ کے رب کی پکڑ سخت ہے،

ترقی کا جذبہ اس سے انسان کسی ایک حالت پر قانع نہیں رہتا بلکہ دن بدن آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی صفات القابض والباسط وغیرہ کا عکس ہے، قرآن حکیم میں ہے:

رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ (المؤمن-۲) — اللہ اونچے درجوں والا عرش کا مالک ہے،

دوسری جگہ ہے

کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (الرحمٰن-۲) — ہر روز وہ ایک نئے کام میں ہے

تسخیر کائنات اس سے انسان کائناتی تصرفات کے قابل بنتا ہے، وہ اشیاء کے خواص و اثرات کی تحقیق کرتا اور مختلف قسم کی معلومات کے ذریعہ ان پر قابو حاصل کرتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صفت تسخیر کا عکس ہے، قرآن حکیم میں تسخیر اشیاء سے متعلق بہت سی آیتیں ہیں، مثلاً

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ
لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً
تَلْبَسُوْنَهَا (النحل-۲)

اللہ ہی ہے جس نے دریا کو تمہارے لیے مسخر کیا تاکہ تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے زیور نکال کر پہنو

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (ابراہیم ۵) — اور تمہارے لیے سورج اور چاند کو مسخر کیا،

وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ (النحل ۲) — اور ستارے مسخر ہیں اس کے حکم سے

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ
مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ (الزخرف-۱)

اللہ کی ذات پاک ہے جس نے جانوروں کو ہمارے لیے مسخر کیا اور ہم اس پر قابو پانے والے نہ تھے،

نفع و نقصان کی چیزوں پر قابو اس سے انسان نفع پہنچانے والی اور نقصان دینے والی چیزوں پر قابو

حاصل کر کے اپنی بالادستی تسلیم کراتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے اوصاف النافع، المانع اور الضار کا عکس ہے، قرآن حکیم میں ہے:

اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا
كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ یُّرِدْكَ
بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ
(یونس۔ رکوع ۲)

اگر اللہ کوئی تکلیف (یا نقصان) پہنچائے تو اس کے سوا اور کوئی ہٹانے والا نہیں اور اگر بھلائی (یا فائدہ) پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔

دوسری جگہ ہے

اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا
كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ
بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ
(انعام-۲)

اگر اللہ کوئی نقصان پہنچائے تو اسکے سوا اور کوئی ہٹانے والا نہیں، اور اگر بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

انتقام و سزا اس سے مدافعت و مقابلہ کی طاقت اور بدلہ لینے کی ہمت و سزا دینے کی جرأت پیدا ہوتی ہے جس سے برائیوں کا استیصال ہوتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صفات المنتقم اور المعذب کا عکس ہے، قرآن حکیم میں ہے:

وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (النور ۵) — اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے

اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِیْدُ الْعِقَابِ (رعد ۱) — بیشک آپ کا رب سخت سزا دینے والا ہے

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا
یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ
شَرًّا یَّرَهٗ (زلزال-۱)

جس شخص نے ذرہ برابر بھلائی کی وہ اس کو دیکھے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر برائی کی وہ اس کو دیکھے گا۔

غرض صفات جلالی کے عکس سے ایسی تعمیری صفات نمودار ہوتی ہیں جن کے ذریعہ نظم و ضبط

کی صلاحیت ابھرتی اور خلافت ونیابت کی شان نمایاں ہوتی ہے،

تشکیل جدید میں جمالی وجلالی دونوں صفات کی نمود ضروری ہے، اگر ان میں کسی ایک کو بھی نظر انداز کیا جائے گا تو زندگی یک رخی بنجائے گی، اور انسان اپنا مقام حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

صفات تکمیلی کے عکس سے پیدا شدہ خوبیاں

صفات تکمیلی سے درج ذیل قسم کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں:۔

پرورش کی صلاحیت

عربی زبان میں ربوبیت کے معنی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق نشوونما دینا اور پرورش کرنا ہیں، مفردات میں ہے:۔

هو انشاء الشئ حالاً فحالاً الى حد التمام (مفردات القرآن)

کسی چیز کو مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ وہ اپنی حدکمال تک پہنچ جائے۔

اس صفت سے پرورش کرنے اور نشوونما دینے کا جذبہ ابھرتا ہے اور انسان محبت وشفقت کے ساتھ حالت وضرورت کے مطابق اشخاص واشیاء کی نگہداشت کرتا ہے،

قرآن حکیم میں ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الفاتحہ - ۱)

تمام تعریفیں اللہ کے لیے سزاوار ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

دوسری جگہ ہے:

قال فمن ربکما یموسیٰ قال ربنا الذی اعطیٰ کل شئ خلقه ثم هدیٰ (طٰہٰ، رکوع ۲)

فرعون نے کہا کہ موسیٰ تم دونوں کا پروردگار کون ہے؟ جواب دیا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اسکی صورت عطا کی پھر راستہ بتایا

رزق، موت، حیات وغیرہ کے ذکر کے بعد ہے:

فذٰلکم اللہ ربکم الحق (یونس ۴۰)

یہ سب کرنے والا اللہ ہی تمہارا حقیقی پروردگار ہے

(باقی)

سر کے بالوں کی شرعی حیثیت

از جناب مولانا حبیب ریحان خاں ندوی

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو "دین قیم" اور امت محمدیہ کو "امت وسط" سے تعبیر کیا ہے اور دین کے سارے معاملات میں یُسر اور آسانی کا لحاظ رکھا ہے، اور بنیادی اور اصولی عقائد واعمال کو چھوڑ کر فروعی معاملات میں اتنی وسعت وسہولت دی گئی ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ذوق کے لوگوں کے لیے ان پر عمل میں کوئی دشواری نہیں ہے۔

عقائد، عبادات، معاملات اور معاشرت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جس کو اسلام نے تشنہ چھوڑا ہو، ان سب کے متعلق کلام مجید اور احادیث نبویؐ میں احکام وہدایات موجود ہیں، ان میں بعض فرض وواجب ہیں، بعض رسول اکرمؐ کے دائمی عمل سے ثابت ہیں، ان کی پیروی سنت ہے، جن کی صریح ممانعت ہے، وہ حرام ہیں، جن اعمال کے بارہ میں حضورؐ نے سکوت اختیار فرمایا، ان کا کرنا جائز ہے، وہ امور جن کا تعلق بنیادی عقائد وعبادات وغیرہ سے نہیں ہے، اس کو شریعت نے مسلمانوں کی فراست تجربہ، عقل وعلم اور عرف پر چھوڑ دیا ہے۔

حرمت کیلئے قطعی الدلالۃ نص کی ضرورت ہے

شریعت میں کسی چیز کو حرام کرنے کے لیے کسی ایسی قطعی الدلالۃ نص کی ضرورت ہے، جو قرآن یا سنت سے ثابت ہو، اور جس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجایش نہ ہو، اس مضمون میں تطویل کے خوف سے ہم نے صرف

چار پانچ مراجع سامنے رکھے ہیں، ورنہ اس موضوع پر بے شمار مراجع ہیں، اس مقالہ میں حسب ذیل موضوعات پر گفتگو کی جائے گی،

۱۔ "قزع" کی ممانعت

۲۔ نئے طرز کے موجودہ بال "قزع" میں داخل نہیں،

۳۔ بال رکھنا افضل، اقرب الی الصواب اور سنت ہے۔

۴۔ مانگ نکالنا سنت ہے، لیکن نہ نکالنا بھی جائز ہے،

۵۔ بالوں میں کنگھی کرنا اور تیل ڈالنا مستحب ہے۔

۶۔ بال منڈانے کو مکروہ یا ناجائز کہنے والوں کے دلائل۔

۷۔ بال رکھنا افضل ہے لیکن منڈانا بھی جائز ہے۔

قزع کی ممانعت | بالوں کا معاملہ درحقیقت انسانی ذوق و زینت سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کو سنتِ جمالی کہا جا سکتا ہے، یہ دین کا کوئی ایسا بنیادی عقیدہ یا اصولی مسئلہ نہیں کہ اس پر ترک سلام و کلام اور توبہ و کفارہ کی ضرورت ہو، اسلام میں توبہ گناہ پر ہوتی ہے، اور صرف خدا کے روبرو ہوتی ہے، اور کفارہ غریبوں کا حق ہے اور صرف بھول چوک یا گناہ کی ان صورتوں میں واجب ہے جن کی صراحت شریعت میں موجود ہے، عام حالات میں سر منڈانے کا کفارہ شارع نے قرآن و سنت کی کسی نص میں مقرر نہیں فرمایا، بلکہ اس کی آزادی ہے کہ مسلمان جس طرح کے بال مناسب سمجھیں رکھیں، صرف ایک طرز کے بال رکھنے کی ممانعت ہے، اور وہ ہے "قزع" صحیح مسلم میں ہے:۔

عن نافع عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نہی عن القزع قلت لنافع وما القزع قال یحلق بعض راس الصبی ویترک بعضاً[1]	نافع نے ابن عمرؓ سے یہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قزع سے منع فرمایا، راوی کا بیان ہے کہ میں نے نافع سے پوچھا قزع کیا ہے، انھوں نے کہا کہ بچہ کا کچھ سر مونڈا جائے اور کچھ چھوڑ دیا جائے۔

نافع کی اس شرح کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:۔

احلق کلہ او دعہ کلہ[2]	یا سب کو مونڈو یا سب کو چھوڑ دو

امام نوویؒ اس سلسلہ میں کہتے ہیں کہ قزع کا مطلب سر کے کسی حصہ کو مونڈنا ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ سر کو متفرق جگہوں سے مونڈنا ہے، مگر صحیح پہلی بات ہے[3]"، اس کے بعد نووی رقم طراز ہیں:۔

واجمع العلماء علی کراھۃ القزع اذا کان فی مواضع متفرقۃ الا ان یکون لمداواۃ ونحوھا وھی کراھۃ تنزیہ[4]	علماء کا اجماع ہے کہ قزع مکروہ ہے، اگر وہ متفرق جگہوں سے ہو لیکن علاج وغیرہ کے لیے اجازت ہے، اور یہ کراہت تنزیہی ہے،

امام نووی نے قزع کو کراہتِ تنزیہی سے تعبیر کیا ہے، اور باب بھی "باب کراہۃ القزع" قائم کیا ہے، محدثین و فقہاء کی اصطلاحوں میں بہت باریک بینی سے کام لیا گیا ہے، جس سے کسی چیز کی حرمت، کراہت، جواز یا استحباب وغیرہ کا پتہ چل سکتا ہے، مثلاً دوسرے باب کا عنوان ہے "باب النہی عن الجلوس فی الطرقات"۔ تیسرے باب کا عنوان ہے "تحریم فعل الواصلۃ والمستوصلۃ والواشمۃ والمستوشمۃ"۔ ایک باب کا عنوان ہے

---

[1] صحیح مسلم بشرح النووی، المطبعۃ المصریۃ ج ۱۴ ص ۱۰۱ [2]، [3]، [4] ایضاً

"باب استحباب لبس النعال فی الیمنیٰ اولاً والخلع من الیسریٰ" یا "باب اباحۃ اکل الثوم" یا "باب جواز ارداف المراۃ الاجنبیۃ اذا اعیت فی الطریق"۔

اس لیے بالوں کی صرف ایک شکل مکروہ ہے، اور وہ قزع ہے، کیونکہ بال سنت جمال ہے، اور قزع میں یعنی کہیں بالوں کا گچھا ہو، کہیں سے چند یا صاف ہو، یا سر منڈا ہوا ہو صرف بیچ میں بال ہوں، ان سب صورتوں میں بالوں کا جمال ختم ہو جاتا ہے، اور ایک بدنما ہیئت پیدا ہو جاتی ہے، اسلیے اسکی ممانعت ہے۔

نئے طرز کے بال قزع میں داخل نہیں

موجودہ دور کے عام بالوں کو بعض لوگ قزع میں داخل کرتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے، یہ بال کسی صورت میں بھی قزع میں نہیں آتے جن کی شرح نافع نے کی ہے، کیونکہ وہ اس طرح نہیں کاٹے جاتے کہ سر کا کچھ حصہ بالکل صاف ہو جائے اور کچھ میں بال ہوں، اور نہ ان بالوں میں آتے ہیں جن کی کراہت پر امام نووی نے اجماع لکھا ہے، یعنی جگہ جگہ سے کہیں بال کٹے ہوں اور کہیں موجود ہوں، پھر حدیث میں لفظ حلق خاص دلالت رکھتا ہے، نیز امام نووی کی اس وضاحت سے کہ علاج کیلئے قزع کیا جا سکتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیچ سے بالوں کو استرے سے اس طرح کاٹا جائے کہ سر کی جلد دکھائی دینے لگے، موجودہ بالوں میں حلق نہیں ہوتا، نئے طرز کے بال قینچی سے تراش کر برابر کیے جاتے ہیں، اور یہ تراش خراش گردن کی سمت ہوتی ہے، اسلیے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسنون اور پٹے دار بالوں کی طرح سب جگہ سے برابر نہیں ہوتے اور یہ صحیح ہے لیکن کراہت یا عدم جواز جن بالوں کے لیے ہے ان میں وہ کسی طرح شامل نہیں ہوتے، مونڈنے اور تراشنے میں بڑا فرق ہے، امام احمد کی ایک روایت میں جہاں انھوں نے سر مونڈنا مکروہ اور ناجائز لکھا ہے، یہ تصریح کر دی ہے کہ جو بال استرے سے مونڈے جائیں وہ مکروہ ہیں، قینچی سے نہیں،

قال احمد انما کرھوا الحلق بالموسیٰ	امام احمد نے کہا حلق استرے سے مکروہ سمجھتے تھے،
واما المقراض فلیس بہ باس لان	قینچی سے کوئی حرج نہیں، کیونکہ کراہت کے
ادلۃ الکراھۃ تختص بالحلق[1]	دلائل حلق کے ساتھ مخصوص ہیں،

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ حلق کا لفظ استرے سے مونڈنے کیلئے خاص ہے، غرض کسی چیز کی حرمت یا عدم جواز کے لیے جس محکم دلیل کی ضرورت ہے وہ ان بالوں کے لیے نہیں پائی جاتی۔

رہی مسئلہ کی دوسری شق کہ یہ بال کم سے کم فیشن ایبل یا ماڈرن طرز کے ہوتے ہیں، تو یہ ضروری نہیں کہ ہر فیشن ایبل چیز شریعت کے خلاف ہو، کسی چیز کی حرمت و کراہت کے لیے نصوص اور شرعی دلائل کے بجائے یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ یہ چیز فیشن ایبل طرز کی ہے،

تشبہ بالقوم کے دائرے میں بھی یہ بال نہیں آتے، کیونکہ تشبہ سے مراد وہ دینی شعائر ہیں جو دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ مخصوص ہیں، جیسے بپتسمہ لینا، یا گرجا میں جا کر مسح کرانا وغیرہ، جب تک کسی چیز کی حرمت یا کراہت کے قطعی نصوص نہ ہوں صرف اس لیے ان کو حرام یا مکروہ نہیں کہا جا سکتا کہ دوسرے لوگ وہ کام کرتے ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری قوموں کی بعض چیزیں استعمال کی ہیں، جنکا تعلق لباس یا اسلحۂ جنگ وغیرہ سے تھا، اس کی تفصیل شمائل اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے اور جو چیزیں حرام تھیں ان کو کبھی استعمال نہیں فرمایا، اور ان کی ممانعت فرمائی، خواہ وہ عربوں کی ہوں یا دوسروں کی،

---

[1] المغنی لابی محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ، مطبعۃ الامام قاہرہ، ج اول ص ۹۶

اس بحث کا یہ مقصد فیشن ایبل بالوں کی ترغیب دینا یا اس کو پسند کرنا نہیں، بلکہ صرف یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں حرمت و حلت یا جائز و ناجائز کے جو شرعی حدود ہیں یا ان کیلئے جن صریح دلائل کی ضرورت ہے، ان کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

فتویٰ صرف جائز و ناجائز پر دیا جائے گا، البتہ تقویٰ اور اتباع سنت کا تقاضا یہ ہے کہ جیسے بال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھے ویسے رکھے جائیں، بال منڈوانے کے سلسلے میں بھی یہی فتویٰ دیا جائے گا کہ وہ جائز ہیں، حالانکہ بال منڈانے کے خلاف بہت سے دلائل ہیں، اور نئے طرز کے بالوں کے خلاف کوئی دلیل نہیں، پھر ہر شخص اپنی دینی تربیت اور ذوق سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ افضل اور مسنون طریقہ کیا ہے، جائز کیا ہے، اور مکروہ کیا ہے؟ اور اسے کیا کرنا چاہیے؟

بال رکھنا افضل ہے جو شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع اور آپکے اسوہ پر چلنا چاہتا ہے، اس کو بال ایسے رکھنے چاہئیں جو آپ سے ثابت ہیں، قرآن پاک میں بال رکھنے کے سلسلے میں کوئی نص موجود نہیں، البتہ حج میں بال منڈانے یا کترانے کے سلسلے میں چند آیات ہیں، جن پر آگے چل کر حلق کے سلسلے میں گفتگو کی جائے گی، ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حج وعمرہ کے علاوہ بال رکھنا تقاضائے فطرت ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کی احادیث کو پیش نظر رکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ حج وعمرہ کے علاوہ آپ نے کبھی بال نہیں منڈوائے، اور نہ کتروائے، شمائل ترمذی کے شارح امام شیخ ابراہیم الباجوری نے شرح المصابیح کے حوالہ سے ابن عربی کا یہ قول نقل کیا ہے،

لم یحلق النبی راسہ فی سنی	حضورؐ نے ہجرت کے سالوں میں کبھی بال
الھجرۃ الا فی عام الحدیبیۃ	نہیں منڈائے صرف حدیبیہ والے سال

وعمرۃ القضاء وحجۃ الوداع	اور عمرۃ القضاء میں اور حجۃ الوداع میں
ولم یقصر الا مرۃ واحدۃ	اور عمر میں صرف ایک مرتبہ قصر کرائے
فی الصحیحین [۱]	جیسا کہ صحیحین میں ہے۔

اب موئے مبارک کی ایک جھلک احادیث میں دیکھئے، آپ کے بال نہ تو زیادہ گھونگھریالے تھے، نہ بالکل سیدھے، سپاٹ، [۲] حضرت انس بن مالکؓ کے بیان کے مطابق نصف کانوں تک تھے، [۳] حضرت براء بن عازبؓ حضور کے جمال مبارک کے بارہ میں فرماتے ہیں، ایسا شخص میں نے دیکھا ہی نہیں، کان کی لو سے لیکر مونڈھے تک آپ کے بال تھے، [۴] یعنی کبھی کان کی لو تک رہتے تھے کبھی بڑھکر شانہ تک آجاتے تھے،

ان احادیث سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ آپ نے حج اور عمرہ کے علاوہ کبھی بال نہیں منڈوائے، بلکہ ہمیشہ رکھے، جب وہ گھٹتے تھے تو نصف کانوں تک رہتے تھے، اور جب بڑھتے تھے تو مونڈھوں تک پہنچ جاتے تھے، اس لیے بالوں کا اقرب الی السنۃ اور افضل ترین طریقہ وہی ہے، جس طریقے پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بال رکھے، ابن قدامہ لکھتے ہیں:۔

ویستحب ان یکون شعر الانسان	مستحب یہی ہے کہ انسان کے بال حضور انور
علی صفۃ شعر النبی صلی اللہ	صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کی طرح ہوں جب
علیہ وسلم اذا طال فالی منکبیہ	بڑھیں تو مونڈھے تک آجائیں اور گھٹیں تو
وان قصر فالی شحمۃ اذنیہ [۵]	کان کی لو وں تک رہیں۔

---

[۱] الشمائل المحمدیہ للترمذی حاشیہ الباجوری، مطبعۃ السعادہ مصر ص ۳۸ [۲] المغنی ج ۱ ص ۹۵
[۳] المغنی ج ۱، ص ۹۵ [۵] ایضاً

اس لیے ضرورت سے زیادہ چھوٹے بال بھی مسنون طریقے سے اس طرح خارج ہو جائیں گے، جس طرح بہت زیادہ بڑے بال لیکن جائز دونوں ہیں،

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عمل کے پیشِ نظر ابن قدامہ نے یہ فیصلہ کیا ہے،

واتخاذ الشعر افضل من ازالتہ[1]

بالوں کا رکھنا ز، کھنے سے افضل ہے،

کسی نے ابو عبداللہ سے پوچھا کہ بال رکھنا کیسا ہے، انھوں نے جواب دیا:

سنۃ حسنۃ لو امکننا اتخذناہ[2]

اچھی سنت ہے اگر ممکن ہوتا تو ہم بھی اس پر عمل کرتے،

امام قرطبی لکھتے ہیں:-

وقد اجمع العلماء علی حبس الشعر واباحۃ الحلق[3]

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ بالوں کا رکھنا افضل ہے اور حلق جائز ہے

ابن عربی کا قول ہے:-

والشعر فی الراس زینۃ وترکہ سنۃ[4]

بال سر کی زینت ہیں اور ان کا رکھنا سنت ہے،

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ بال رکھنا افضل اور مسنون ہے، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بالوں کے لیے علماء، محدثین نے سنت، افضلیت اور مستحب کے الفاظ استعمال کیے ہیں، فرض و واجب کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے، کیونکہ وہ (۳) حقیقت سے واقف تھے کہ کسی چیز کے فرض یا واجب ہونے کے لیے قطعی احکام و دلائل کی ضرورت ہوتی ہے،

ان حدیثوں سے بھی بال رکھنے کی تائید ہوتی ہے جن سے	فرق افضل ہے اور سدل جائز ہے

---

[1] المغنی ج ۱ ص ۹۵ [2] الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۲ ص ۱۰۵ [3] [4] شمائل ترمذی الباجوری ص ۳

ظاہر ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مانگ نکالا کرتے تھے، کیونکہ بالوں کے بغیر مانگ نکالنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، عبداللہ بن عتبہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یسدل شعرہ وکان المشرکون یفرقون رؤسھم وکان اھل الکتب یسدلون رؤسھم وکان یحب موافقۃ اھل الکتب فیما لم یؤمر فیہ بشیئ ثم فرق رسول اللہ راسہ[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بالوں کو سیدھا چھوڑ دیتے تھے اور مشرکین مانگ نکالتے تھے، اور اہل کتاب مانگ نہ نکالتے تھے، اور حضور ان چیزوں میں اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے جن میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا جاتا تھا، پھر آخر میں مانگ نکالنے لگے،

امام قرطبیؒ نے اس حدیث کو نسائی کے حوالے سے نقل کیا ہے[2]، امام مسلم نے الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے[3]،

امام قرطبی نے قاضی عیاض کے حوالے سے اور امام نووی نے شرح مسلم میں سدل کے معنی یہ بیان کیے ہیں:-

سدل الشعر ارسالہ والمراد ھنا عند العلماء ارسالہ علی الجبین[4]

سدل کے معنی ہیں بالوں کو چھوڑ دینا لیکن یہاں علماء کے نزدیک مراد ہے پیشانی پر چھوڑ دینا،

---

[1] شمائل حاشیۃ الباجوری ص ۱۳ [2] تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۱۰۵ [3] مسلم شرح نووی ج ۱۶ ص ۹۰ [4] قرطبی ج ۲ ص ۱۰۵، مسلم ج ۱۶ ص ۹۰

اہل کتاب کی موافقت حدیث کا یہ ٹکڑا کہ جس چیز میں آپ کے پاس وحی کا حکم نہیں ہوتا تھا، صاف بتا رہا ہے کہ بالوں کا معاملہ انسانی ذوق و جمال کا معاملہ ہے، البتہ یہ ٹکڑا کہ آپ اس میں اہل کتاب کی موافقت کرتے تھے، قابل غور ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ جائز چیز میں اگر کسی قوم کی موافقت کی جائے تو وہ تشبہ بالقوم میں داخل نہیں ہوتی، اسی لیے آپ نے اہل کتاب کے طرز پر پہلے سدل کیا، پھر جب دیکھا کہ بالوں کی صفائی، نظافت اور جمال کے لیے مانگ نکالنا بہتر ہے تو مانگ نکالنے لگے، یہ کہنا کہ اللہ کے حکم سے یہ تبدیلی ہوئی، صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اگر حکم سے ایسا ہی ہوتا تو آپ سدل کی ممانعت فرما دیتے، مگر ایسا نہیں کیا، چنانچہ بعض صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی سدل ثابت ہے، اس لیے اصل مسئلہ جائز و ناجائز اور صحیح و سقیم کا ہے، یہ نہیں ہے کہ کوئی دوسری قوم کیا کرتی ہے،

حدیث بالا سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا آخری عمل مانگ نکالنا ہے، اس لیے تبع سنت کے لیے یہی افضل اور اقرب الی الاتباع ہے، قرطبی لکھتے ہیں:-

والفرق فی الشعر سنة[1]	بالوں میں مانگ نکالنا سنت ہے

امام مالک کا قول ہے:

فرق الرجل احب الی[2]	آدمی کا مانگ نکالنا مجھے پسند ہے

ابن قدامہ لکھتے ہیں:

ویستحب فرق الشعر لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم فرق شعرہ وذکرہ من الفطرة[3]	مانگ نکالنا مستحب ہے کیونکہ نبی صلعم نے مانگ نکالی اور اسے فطرت کی چیزوں میں سے بتایا،

[1] تفسیر قرطبی ۲/۱۰۵ [2] مسلم شرح نووی ۱۶/۹۰ [3] المغنی ۱/۹۵

لیکن آپ نے سدل کی ممانعت نہیں فرمائی اور بعض صحابۂ کرام سے ثابت ہے کہ انھوں نے اس کے بعد بھی سدل کیا، اگر یہ جائز نہ ہوتا تو حضورؐ اس کی ممانعت فرما دیتے، اور صحابۂ کرام اس کے خلاف عمل کرتے، شیخ ابراہیم ابا جوری لکھتے ہیں:

الحدیث یدل علی جواز الامرین والامر فیہ وسیع لکن الفرق افضل لکون النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجع الیہ آخرا ولیس بواجب فقد نقل ان من الصحابة من سدل بعد ولو کان الفرق واجبا لما سدلوا[1]	حدیث دونوں چیزوں کے جواز پر دلالت کرتی ہے، اور اس معاملہ میں وسعت ہے، لیکن مانگ افضل ہے کیونکہ نبی صلعم نے آخر میں مانگ نکالی، لیکن واجب نہیں ہے کیونکہ بعض صحابہ سے منقول ہے کہ انھوں نے سدل کیا، اگر مانگ نکالنا واجب ہوتا تو صحابہ کبھی سدل نہ کرتے،

مگر مانگ کے افضل ہونے اور سدل کے جائز ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا یہ عمل قرطبی نے نقل کیا ہے:

کان اذا انصرف من الجمعة اقام علی باب المسجد حرسا یجزون ناصیة کل من لم یفرق شعرہ[2]	وہ جب جمعہ سے واپس ہوتے تو مسجد کے دروازے پر نگراں مقرر کرتے جو ہر اس شخص کی پیشانی کے بال کاٹتے جو مانگ نہ نکالتا ہو۔

اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کی تاویل یہ کی جاسکتی ہے کہ آپ کو اتباع سنت کا اس درجہ اہتمام تھا کہ آپ نے حضورؐ کے آخری عمل کو نافذ کرنا ضروری سمجھا، یا یہ سبب ہا کو

[1] شمائل ص ۱۳ [2] تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶

کچھ لوگوں نے بالوں کی صفائی ستھرائی چھوڑ دی ہو یا بال پریشان رکھتے ہوں، یا کوئی ایسا سبب ہو جس کی بنا پر آپ نے یہ تادیبی کارروائی کی ہو، اس لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ عمل کسی وقتی ضرورت یا مصلحت کی بنا پر توصحیح ہو سکتا ہے لیکن سدل کے جواز کے دلائل کی موجودگی میں حجت نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس کا عدم جواز شریعت سے ثابت نہیں، بعض صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سدل کرتے تھے، اور شریعت نے جس چیز میں آسانی رکھی ہو اس میں تنگی بلا وجہ صحیح نہیں ہے،

بالوں میں کنگھی کرنا اور تیل ڈالنا مستحب ہے

بال رکھنا سنت ہے، اور ان میں مانگ نکالنا افضل ہے، لیکن اگر بالوں میں تیل نہ ڈالا جائے، کنگھی نہ کی جائے، ان کی صفائی کا خیال نہ رکھا جائے تو ان میں گندگی یا جوئیں پیدا ہو سکتی ہیں، اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

من کان لہ شعر فلیکرمہ[1]	جس کے بال ہوں اسے انکا اکرام کرنا چاہیے

اور عملاً بھی اس کی تعلیم دی، چنانچہ اعتکاف کی حالت میں بھی آپ بالوں کی صفائی کا خیال رکھتے تھے، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اعتکف یدنی راسہ واسرجلہ[2]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف فرماتے تھے تو اپنا سر میرے قریب کر دیتے تھے اور میں کنگھی کرتی تھی،

بالوں میں کنگھی اور ان کی صفائی کرنا مستحب ہے،

ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم.	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی

۱؎ ابو داؤد بحوالہ المغنی ج اول ص ۵۵۹ ۲؎ مسلم ج ۳ ص ۲۰۹

کان یترجل غبا[1]	کنگھی کرتے تھے،

"غبا" کے اصل معنی ہیں کسی کام کو ایک دن بیچ کر کے کرنا، پھر کسی کام کو کبھی کرنے اور کبھی چھوڑ دینے کے معنی میں بولا جانے لگا، یعنی آپ کبھی کنگھی کرتے تھے اور کبھی نہیں کرتے تھے،

بالوں میں تیل بھی ڈالتے تھے، حضرت انس ابنؓ مالک کا بیان ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکثر دھن راسہ[2]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر میں کثرت سے تیل ڈالتے تھے،

کنگھی کرنے، تیل ڈالنے اور بالوں کی زینت و لطافت کی حدیثوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی بال رکھے اسے ان کی دیکھ بھال اور نظافت کا خیال رکھنا چاہیے، لیکن اس میں خود نمائی اور مبالغہ نہ ہونا چاہیے کہ آدمی سارے کاموں کو چھوڑ کر بس بالوں کے سنوارنے میں لگا رہے، شارح شمائل ترمذی لکھتے ہیں کہ

ویوخذ من ھذا ندب تسریح شعر الراس[3]	اس سے بالوں میں کنگھی کرنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔

غرض بال رکھنا، ان میں مانگ نکالنا، کنگھی کرنا، تیل ڈالنا یہ سب حضورؐ کا عمل ہے، اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ سر منڈانے کے مقابلے میں بالوں کو رکھنا اقرب الی السنت ہے،

حلق کو ناجائز کہنے والوں کے دلائل

حلق کے سلسلے میں جمہور کا مسلک جواز کا ہے، یعنی بال منڈائے جا سکتے ہیں، جمہور کے مسلک کی تائید میں دلائل بعد میں بیان کیے جائیں گے

۱؎ شمائل ص ۴۴ ۲؎ ایضاً ص ۴۴ ۳؎ ایضاً ص ۴۳

پہلے حلق کو مکروہ، ناجائز اور بدعت کہنے والوں کے دلائل بیان کیے جاتے ہیں،

حلق کا لفظ قرآن مجید میں حج یا عمرہ کے موقع پر آیا ہے، جو حج اور عمرہ کے ساتھ خاص ہے، حضورؐ کی دائمی سنت یہی ہے کہ آپ نے حج وعمرہ کے علاوہ بال نہیں منڈائے اور حدیث میں ارشاد ہے: لا توضع النواصی الا فی حج او عمرۃ[1]

امام احمد بن حنبل کی ایک روایت میں حلق راس کو مکروہ بتایا گیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضورؐ نے خوارج کے متعلق ارشاد فرمایا تھا کہ سیماهم التحلیق فجعله علامة لهم[2] ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کے سر منڈے ہوئے ہونگے، یعنی یہ خوارج کی علامت ہے،

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے امام احمد نے یہ روایت نقل کی ہے

لیس منا من حلق[3] — وہ ہماری جماعت سے نہیں ہو جو سر منڈائے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صبیغ سے فرمایا تھا

لو وجدتك محلوقا لضربت الذی بین عینیك بالسیف[4] — اگر میں تم کو سر منڈا ہوا پاتا تو تمھاری آنکھوں کے بیچ جو چیز ہے اسے تلوار سے مارتا،

اسی لیے امام احمد نے اسلاف کے متعلق لکھا ہے کہ

وکانوا یکرهون ذالك[5] — وہ اسے مکروہ سمجھتے تھے،

اور ابن عربی نے حلق راس کو بدعت قرار دیا ہے،

والشعر فی الراس زینة وترکه سنة وحلقه بدعة[6] — بال سر کے لیے زینت ہیں، انکو چھوڑنا سنت ہے اور مونڈنا بدعت ہے،

۱؎ رواہ الدارقطنی فی الافراد، المغنی ۱/۹۶ ۲؎ ایضاً ۱/۹۶ ۳؎ رواہ احمد. المغنی ۱/۹۶ ۴؎ المغنی ۱/۹۶ ۵؎ ایضاً ۶؎ شمائل ص ۳۸

امام احمد کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ استرے سے حلق مکروہ ہے، اور یہ ساری گفتگو اسی کے متعلق ہے، قینچی سے کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ کراہیت کے دلائل حلق کے ساتھ مخصوص ہیں، قال احمد انما کرهوا الحلق بالموسی، واما المقراض فلا بأس به لان ادلة الکراهة تختص بالحلق[1]

بال رکھنا افضل ہے لیکن مونڈنا بھی جائز ہے

جمہور علماء کے نزدیک بال منڈانا جائز ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کسی چیز کو حرام یا مکروہ اور ناجائز کہنے کے لیے کسی قطعی الدلالۃ نص یا حکم کی ضرورت ہوتی ہے، جو ایسی واضح اور صریح ہو کہ اس میں کسی قسم کی تاویل ممکن نہ ہو،

یہ صحیح ہے کہ قرآن پاک میں حلق کا تذکرہ دو بار آیا ہے، سورہ بقرہ میں ہے

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى تَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ — اپنے سر نہ مونڈو یہانتک کہ قربانی کا جانور اپنی جگہ پر پہنچ جائے،

سورہ فتح میں ہے:-

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ — اللہ نے رسول کا خواب سچ کر دکھایا، حق کے ساتھ تم داخل ہوگے مسجد حرام میں انشاء اللہ امن کے ساتھ سر مونڈے ہوئے اور کترے ہوئے

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج میں بالوں کا حلق یا قصر ضروری ہے،

۱؎ المغنی ۱/۹۶

اور اس کے علاوہ بال رکھے جا سکتے ہیں، خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج میں حلق کیا تھا، اور حضرت معاویہؓ نے عمرہ میں مروہ پر آپ کے بال قصر کیے تھے۔[1]

یہ صحیح ہے کہ حلق کا تذکرہ ہر حالت میں حج یا عمرہ کے احکام کے ساتھ وابستہ ہے، اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ حج اور عمرہ میں حلق یا قصر ضروری ہے، لیکن یہ ثابت کرنا کہ حلق ناجائز یا مکروہ ہے، کسی طرح صحیح نہیں، اس کے لیے ایسی آیت کی ضرورت ہو جس میں حج اور عمرہ کے علاوہ حلق اور قصر کی صریح ممانعت ہوتی، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی عمل بھی اس کی تائید میں تو پیش کیا جا سکتا ہے کہ بال رکھنا مسنون ہے، اس لیے بال منڈانے کی حرمت یا کراہت کے لیے بھی ایسی ہی عملی مثال کی ضرورت ہے،

جس روایت میں حلق خوارج کی علامت بتائی گئی ہے، اگر وہ صحیح ہو تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حلق ناجائز ہے، کیونکہ اگر کوئی خارجی بال رکھ لے یا داڑھی رکھ لے تو اس سے دونوں کا سنت ہونا ختم نہیں ہو سکتا، حلق کی ممانعت میں سب سے زیادہ قوی دلیل یہ حدیث ہو سکتی ہے کہ "جو حلق کرے وہ ہم میں سے نہیں"۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ حدیث کے یہ الفاظ خاص موقع کے لیے ہیں، یعنی کسی کی موت پر واویلا مچانا، اس کے غم میں بالوں کا منڈانا، اور دوسرے غیر شرعی طریقوں کو اختیار کرنا، بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ حدیث زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ وعید صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو غم والم اور موت کے وقت اس قسم کے کام کرتے ہیں، اس لیے اس حدیث سے استدلال صحیح نہیں ہے، اس کے بعد کوئی

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۶ ص ۲۹۱

دلیل باقی نہیں رہ جاتی، تطویل کے خوف سے صرف صحیح مسلم سے چند روایتیں پیش کی جاتی ہیں، حضرت ابو موسیٰ اشعری سخت درد اور تکلیف میں مبتلا تھے، ان کا سر ان کی بیوی کے زانو پر تھا، ان کی حالت دیکھکر ان کے گھر کی کسی عورت نے زور سے چیخنا شروع کیا، حضرت ابو موسیٰؓ اس وقت درد و کرب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے، مگر جوں ہی افاقہ ہوا فرمایا:-

انا بریٔ مما بری منه رسول الله	میں اس سے بری ہوں جس سے رسول اللہ
صلی الله علیه وسلم فان رسول الله	صلی اللہ علیہ وسلم نے برأت کی ہے، بیشک
صلی الله علیه وسلم بری من الصالقة	رسول اللہ صلعم نے برأت ظاہر کی ہے چیخنے والی
والحالقة والشاقة[1]	بال کاٹنے والی اور کپڑے پھاڑنے والی سے۔

صالقہ وہ عورت جو مصیبت کے وقت بلند آواز سے چیخے، حالقہ جو بال کٹائے، شاقہ وہ جو کپڑے پھاڑے، اس حدیث میں مؤنث کا صیغہ استعمال ہوا ہے، کیونکہ عام طور پر عورتیں ہی ماتم و نوحہ میں بال نوچتی ہیں، دوسری روایت میں مذکر کے صیغہ کے ساتھ بھی آیا ہے، حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے،

الم تعلمی وکان یحدث ان	کیا تم کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ
رسول الله صلے الله علیه وسلم	علیہ وسلم نے فرمایا میں بری ہوں اس سے
قال انا بری ممن حلق وسلق	جس نے سر مونڈا، بلند آواز سے چیخا
وخرق[2]	اور کپڑے پھاڑے،

امام مسلم نے عیاض الاشعری کے حوالے سے برأت کے بجائے "لیس منا من حلق

[1] مسلم شرح نووی ج ۲ ص ۱۱۰ [2] ایضاً ص ۱۱۱

وسلق وخرق[1] روایت کیا ہے،

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حلق کی وعید خاص ماتم اور موت وغم کے موقع کے لیے ہے، عام حالات میں بال منڈانے سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں، ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد مصیبت میں بال منڈوانا ہے،[2]

اس تفصیل کی روشنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے جو آپ نے صبیغ سے فرمایا کہ اگر تم سر منڈائے ہوتے تو میں تمہیں تلوار سے مارتا، ممکن ہے کہ آپ نے کسی ایسے ہی موقع پر یہ تنبیہ کی ہو، یا کسی خاص موقع پر خاص حالت کی بنا پر ایسا فرمایا ہو، اس پر عام حکم لگا کر اس کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا،

اس سے مثلہ مراد لینا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ مثلہ تو حج یا عمرہ کسی میں بھی جائز نہیں ہے، احادیث میں اس کی صریح ممانعت ہے،

عن ابی حنیفة عن علقمة عن	ابو حنیفہ علقمہ سے وہ ابن بریدہ سے وہ
ابن بریدة عن ابیه ان رسول اللہ	اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ
صلے اللہ علیه وسلم نهی عن المثلة[3]	صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا ہے،

مثلہ کے معنی ہیں کسی عضو کو کاٹ ڈالنا، سر کے بال مونڈنا اس میں داخل نہیں ہو سکتا، بدعت اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی حرمت پر کوئی قطعی دلیل موجود نہیں ہے، جائز چیز کے کرنے میں بدعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، امام قرطبی نے حضرت علیؓ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ حلق کرتے تھے۔

وکان علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ	حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
یحلق رأسه[4]	اپنا سر مونڈتے تھے۔

[1] مسلم ج ۲ ص ۱۱۱ [2] المغنی ج اول ص ۹۷ [3] مسند الامام ابو حنیفہ، مطبعۃ الاصیل حلب ص ۱۵۲ [4] تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۳۸۳

اگر سر مونڈنا بدعت ہوتا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منع فرما دیتے اور خود حضرت علیؓ یہ کام نہ کرتے، حضرت علیؓ کا یہ عمل حلق کے جائز ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے، لیکن حضور انور صلعم اور صحابہ کرامؓ کے دائمی عمل یعنی بال رکھنے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کسی مجبوری یا ضرورت کی وجہ سے سر منڈاتے ہوں گے، جو بہر حال جائز ہے،

حضرت جعفرؓ کے بچوں والی حدیث مثلہ کے جواب میں تو پیش کی جا سکتی ہے لیکن حلق کے جواز میں پیش نہیں کی جا سکتی، کیونکہ یہ عمل مجبوری کی وجہ سے تھا، ان کی ماں اس وقت جس غم والم میں مبتلا تھیں، اس میں بچوں کے بال کی نگہداشت نہیں کر سکتی تھیں، اور مجبوری کی حالت میں خصوص کو عموم سے بدلا جا سکتا ہے، جیسے کسی مجبوری کی وجہ سے قربانی کے جانور کو ذبح کرنے سے پہلے بھی حلق کی اجازت ہے، بہر حال حلق کے جواز کے لیے اس واقعہ سے سند کی کوئی ضرورت بھی نہیں،

حلق جائز ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ قرآن وسنت میں کہیں اس کو مکروہ یا ناجائز نہیں کہا گیا، اور تمام چیزوں کی اصل اباحت اور جواز ہے، جب تک شارع ان کو حرام یا ناجائز نہ قرار دے، دوسرے یہ کہ قزع والی صورت میں ارشاد ہے کہ "احلق کله اودعه کله"[1] یعنی یا تو پورا سر مونڈ دو یا پورا چھوڑ دو، قزع نہ کرو، یہ حدیث پاک خود جواز حلق کی موید ہے،

حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ارشاد ہے:

من کان له شعر فلیکرمه	جس کے بال ہوں وہ انکا اکرام کرے

[1] صحیح مسلم شرح نووی ج ۱۴ ص ۱۰۱

اس سے پوری طرح واضح ہے کہ اگر بالوں کی دیکھ بھال نہ کر سکتا ہو تو منڈا دے، لیکن بال رکھکر انکی دیکھ بھال کرنا اولیٰ و افضل ہے،

اس لیے حضرت ابو عبداللہ نے فرمایا کہ "بال رکھنا سنت حسنہ ہے، اگر ممکن ہوتا تو ہم بھی کرتے"[۱] یعنی کسی مجبوری یا بالوں کی دیکھ بھال کی زحمت سے بچنے کے لیے بال نہیں رکھے اور سہولت اور جواز کی راہ اختیار کی،

اسی کے پیش نظر اس پر اجماع ہے کہ بال رکھنا جائز ہے، خود امام احمدؒ سے اس باب میں روایات مختلف ہیں، ابن قدامہ لکھتے ہیں :

واختلفت الروایة عن احمد فی حلق الراس[۲]

امام احمدؒ سے حلق راس کے سلسلے میں مختلف روایتیں ہیں،

یعنی بال رکھنے اور منڈ والے دونوں کی روایتیں ہیں، اور منڈانے کے جواز پر علماء کا اجماع ہے۔

وقد اجمع العلماء علی اباحة الحلق وکفی بهذا حجة[۳]

علماء کا اجماع ہے کہ حلق مباح ہے اور یہ حجت کے لیے کافی ہے

قرطبی نے بھی ابن عبد البر کا قول نقل کیا ہے،

وقد اجمع العلماء علی حبس الشعر وعلی اباحة الحلق وکفی بهذا حجة

علماء کا اجماع ہے کہ بالوں کا رکھنا (افضل) ہے اور حلق جائز ہے، یہ حجت کے لیے کافی ہے۔

امام قرطبی فیصلہ کن انداز میں فرماتے ہیں :-

---

[۲] المغنی ج ۱ ص ۹۵ [۳] ایضا ص ۹۵ [۴] ایضاً [۵] تفسیر قرطبی جلد ۲ ص ۳۸۳

ولاخلاف ان حلق الراس فی الحج نسك مندوب الیه وفی غیر الحج جائز[۱]

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حج میں سر منڈانا مناسک حج میں ہے اور مندوب ہے، اور حج کے علاوہ جائز ہے۔

حاصل بحث اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ بال سنت جمالی ہے، قزع کے علاوہ ہر طرح کے بال رکھے جا سکتے ہیں، انسان اپنے ذوق و زینت کے پیش نظر جیسے چاہے بال رکھ سکتا ہے، شارعؑ نے اس باب میں کوئی پابندی نہیں لگائی ہے، اور کسی خاص قسم کے بال رکھنے کا حکم نہیں دیا ہے،

(۲) قزع کے علاوہ موت یا غم والم کے رسوم میں بال منڈانا منع ہے، مجبوری کی حالت اس سے مستثنیٰ ہے۔

(۳) افضل اور مسنون بال رکھنا ہے،

(۴) بالوں میں مانگ نکالنا سنت ہے،

(۵) سدل جائز ہے۔

(۶) تیل ڈالنا اور کنگھی کرنا مندوب و مستحب ہے،

(۷) بال منڈانا بھی جائز ہے، جب ان کی دیکھ بھال نہ ہو سکے،

(۸) یہ ساری تفصیل مردوں کے بالوں کے متعلق ہے،

(۹) اس بحث کا تعلق عورتوں کے بالوں سے نہیں،

---

[۱] تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۳۸۳

سراجاً منیرا

(علمی وعقلی نقطۂ نظر سے)

از جناب محمد شہاب الدین صاحب ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور

(۲)

نماز کا صحیح مقام دنیا کی اصلاح اور معاشرہ کی اخلاقی و روحانی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے نہ صرف تربیتی کورس ضروری ہے بلکہ ایک مثالی کردار اور آئیڈیل نمونے کی بھی ضرورت ہے، تاکہ لوگ اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر سکیں پیغمبر آخر زماںؐ کو یہی مثالی و مرکزی کردار بنا کر پوری "امت دعوت"[1] اور "امت اجابت"[2] کے سامنے پیش کیا گیا، یہ مثالی کردار آج ہمارے سامنے "سنت نبوی" کی شکل میں موجود و محفوظ ہے، جس کو "اسوۂ رسول" بھی کہتے ہیں،

اس تربیتی کورس کی بہترین شکل اسلامی نماز ہے، جس کے ذریعہ بندہ ہر دن پانچ مرتبہ بارگاہ احدیت میں حاضر ہو کر اپنی عبدیت کا اعتراف کارزار حیات میں ذات باری کو فراموش نہ کرنے، ہمیشہ و ہر حال میں اس کو حاضر و ناظر جاننے اور اسکے احکام سے سرتابی نہ کرنے کا اقرار و اعتراف کرتا ہے،

ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے "کاروبار حیات" کے دوران میں روزانہ کم از کم

[1] اس سے مراد قیامت تک کے تمام لوگ اور پوری نوع انسانی ہے [2] اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے۔

پانچ پانچ مرتبہ اپنے مالک و آقا اور رب کریم کے حضور میں حاضری دے رہا ہو، جس کے متعلق خود اس کا یہ عقیدہ ہو کہ وہ تمام کھلے اور چھپے کا جاننے والا اور دلوں تک کے اسرار سے واقف ہے، ــ وہ اس کے احکام و مرضیات سے سرتابی کیسے کر سکتا ہے؟

نماز در اصل جذبۂ عبودیت کے اظہار کے علاوہ احتساب اعمال کا بھی ذریعہ ہے، جس کی بدولت نہ صرف نفس کی تہذیب ہوتی ہے بشرطیکہ نماز کو نماز سمجھ کر اس کے پورے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے، جس کو قرآن حکیم کی اصطلاح میں "اقامت صلوٰۃ" کہا گیا ہے،

جب بندوں کا یہ حال ہو جائے گا تو معاشرہ کی کایا پلٹ جائے گی، نہ کوئی کسی پر ظلم و زیادتی کرے گا اور نہ کسی کا حق مارے گا، نہ کوئی برائی سرزد ہو گی، نہ بد اخلاقی و بدکاری کی جانب قدم اٹھ سکیں گے، اسی لیے کہا گیا ہے

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت: ۴۵) — نماز یقیناً برائیوں اور بدکاریوں سے روکتی ہے۔

تصوف کیا ہے اس لحاظ سے نماز "تزکیۂ نفوس" اور تہذیب اخلاق کا بڑا ذریعہ ہے مگر اس تزکیہ کی تکمیل تصوف کے ذریعہ ہوتی ہے، جس سے تقویٰ و طہارت اور خوف و خشیت الٰہی کا اعلیٰ درجہ حاصل ہوتا ہے،

مگر تصوف شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں، بلکہ اس سے حقیقتاً شریعت ہی کی تکمیل مقصود ہے، وہ شریعت کی ضد نہیں بلکہ اس کا خادم اور متمم ہے، تصوف نام ہے "تزکیۂ نفوس" کا، اور جو چیز شریعت کے خلاف اور اس کی ضد ہو، وہ

تصوف ہی نہیں بلکہ ضلالت و گمراہی ہے۔

تصوف کا منشائے مقصود سوز جگر کو جلا دینا اور "عشق الٰہی" کی آگ کو بھڑکانا ہے جو سارے محاسن اخلاق کا سرچشمہ ہے۔

سنت رسول

اب رہا مثالی کردار اور آئیڈیل نمونہ تو وہ "اسوۂ رسول" اور "سنت نبوی" کی شکل میں موجود و محفوظ ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال و افعال یا عملی طریقے مراد ہیں جو آپ نے "تزکیۂ نفوس" اور "تعلیم کتاب" کی تشریح و توجیہ کے لیے اختیار کیے۔ اسی کا دوسرا نام "حکمت" ہے۔ "ویعلمھم الکتب و الحکمۃ"[1] کا مفہوم یہی ہے۔

غرض رسول کی حیثیت محض ڈاکیہ اور پیامبر کی نہیں ہوتی بلکہ انسانوں کی تعلیم و تربیت اور اس کی اخلاقی و روحانی اصلاح کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے، وہ جس طرح عقائد کی اصلاح کرتا ہے، اسی طرح مراسم عبودیت بھی سکھاتا ہے، آپس کے قضیے چکاتا ہے، باہمی مناقشات و نزاعی امور کے درمیان فیصلے کرتا ہے، وہ صرف احکام خداوندی بندوں تک نہیں پہنچاتا بلکہ ان کے نشیب و فراز بھی سمجھاتا ہے، آیات الٰہی کی تلاوت کے ساتھ ان کی تعلیم بھی دیتا ہے، ان کے معانی و مطالب اور ان کے غوامض و اسرار سے بھی آگاہ کرتا ہے، اور اپنے عمل سے ان تمام امور کی مزید وضاحت کرتا اور

---

[1] پوری آیت شروع میں گزر چکی ہے، جو یہ ہے:-

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (جمعہ: ۲)

وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی کی قوم سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو انکو خدا کے احکام پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

زبانی منشا و مقصد کو سمجھاتا ہے، تاکہ کسی معاملہ میں کسی قسم کا شبہہ یا اشتباہ باقی نہ رہ جائے اور لوگ اس کے مطابق اپنی زندگیوں ڈھال لیں، ایسا وعظ و پند جس پر خود عمل نہ ہو اسلام کی نظر میں انتہائی مبغوض اور ناپسندیدہ ہے، ارشاد باری ہے:-

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (صف ۲-۳)

اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو خود کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ بڑی قبیح حرکت ہے کہ تم وہ بات کہو جو خود کرو نہیں۔

یہ نظری اور منطقی حقیقت ہے کہ لوگ اس شخص کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جو محض گفتار کا غازی اور کردار سے تہی دامن ہو اور جس کے اقوال و افعال میں تضاد ہو، عملی لحاظ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن کریم کی عملی تفسیر ہے، یعنی جو احکام و اوامر قرآن میں ہیں، آپ نے خود اس کا عملی نمونہ پیش کیا، اس بنا پر دنیا میں آپ نے ایسا کامیاب اور ہمہ گیر انقلاب برپا کر دیا جس کی مثال پیش کرنے سے پوری انسانی تاریخ قاصر ہے، کیا ایسا لاثانی اور حیرت انگیز انقلاب بغیر عمل و کردار کے محض زبانی باتوں اور خشک لکچروں کے ذریعہ برپا ہو سکتا تھا؟ خود کلام مجید اس کردار پر شاہد ہے،

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (قلم-۴)

بلاشبہ آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔

یہی وہ بلند و اعلیٰ کردار ہے، جس کے اتباع کا قرآن مجید نے حکم دیا ہے

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَ اللّٰہُ

کہہ دو کہ اے مسلمانو اگر تم کو اللہ سے محبت کا دعوی ہو تو میری اتباع کرو، اس کے عوض اللہ بھی تم سے

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ
(آل عمران: ۳۱)

محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا، اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحم دل ہے۔

اور یہی کردار آپ کا اسوہ یا سنت رسول بھی کہلاتا ہے یہ اسوہ یا سنت کوئی وقتی چیز نہیں بلکہ دائمی و ابدی ہے جو رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے روشنی کا منارہ اور انسانیت کا معیار رہے گا، آپ کی بعثت کا مقصد ہی اخلاق و کردار کی تکمیل تھی،

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

میں تو اخلاق کریمانہ کی تکمیل ہی کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

۴۔ چراغ فلک اور چراغ رسالت

دو روشن چراغ غرض اللہ تعالیٰ نے جس طرح عالم انسانیت کی مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے فطرت کا ایک ضابطہ اور آفتاب عالم تاب کو اس ضابطہ کا پابند بنایا، اسی طرح انسان کی اخلاقی و روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے شریعت کا بھی ایک نظام بنایا اور ایک قانون نافذ کیا، اور اس کے نفاذ کے لیے پیغمبروں کو مبعوث کیا تاکہ فطرت اور شریعت کے نظاموں میں توافق و ہم آہنگی برقرار، اور ترازو کے دونوں پلڑے سیدھے رہیں،

جس طرح آفتاب کی پوری زندگی تکوینی (Natural) ضوابط کی پابند ہے، جس سے وہ سرمو تجاوز نہیں کرتا، اسی طرح انبیائے کرام کی زندگی بھی تشریعی ضوابط یا احکام خداوندی کی پابند ہوتی ہے جس سے وہ ارادۃً کبھی تنکے

کے برابر بھی عدول نہیں کرتے، اس طرح اگر سورج کی کرنوں سے پورا خاکدانِ عالم روشن ہوتا ہے تو انبیائے کرام کی حیات آفریں شعاعوں سے دنیائے انسانیت کے قلوب و اذہان منور ہوتے ہیں، اور ان کا زنگ دور ہو جاتا ہے،

اس لحاظ سے انبیائے کرامؑ کی پاکیزہ سیرت اور ان کا مثالی کردار پوری نوعِ انسانی کے لیے روشنی کا عظیم و لافانی منارہ ہے،

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید-۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو یقیناً کھلے کھلے دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری ہے تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب-۳)

تمہارے لیے اللہ کے رسول میں (ان کی سیرت میں) ایک بہترین نمونہ عمل موجود ہے۔

دونوں میں مشابہت اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح آفتاب اپنے تابع سیاروں کو روشن و منور کرتا ہے، اور پوری دنیا کے لیے سامانِ حیات فراہم کرتا ہے، اسی طرح آفتابِ رسالت روحانی کائنات میں جان ڈالتا ہے،

۲۔ جس طرح نیر فلکی ایک نظام کا پابند ہے، جس میں کبھی رد و بدل نہیں ہوتا، اسی طرح رسول کی پوری زندگی خدائی قوانین و ضوابط کی پابند ہوتی ہے، اسی بنا پر انبیائے کرامؑ کی سیرتوں کو "میزان" سے تعبیر کیا گیا ہے،

۳۔ آفتاب کی روشنی اور حرارت اگرچہ خلاق فطرت ہی کی بخشی ہوئی ہے

مگر ذاتی ہوتی ہے، اسی طرح رسول اگرچہ منجانب اللہ مبعوث ہوتا ہے مگر اسکی حیثیت مستقل ہوتی ہے، اور وہ ملکۂ نبوت سے عالم انسانی کے سدھار کیلیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے، جس کو سنت کہا جاتا ہے، بعض سنتیں ایسی ہیں جنکا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے،

(۴) جس طرح سورج کی روشنی درخشاں اور تابناک ہے، اسی طرح آفتاب رسالت کی ضیا باریاں بھی نہایت درجہ روشن اور منور ہیں،

(۵) جس طرح ہماری مادی کائنات آفتاب کی ضرورت مند ہے، اسی طرح روحانی زندگی نیر رسالت کی محتاج ہے،

(۶) جس طرح آفتاب اپنی تپش اور گرمی سے کرۂ ارض کی گندگیوں کو دور، جراثیم کو ہلاک اور مختلف بیماریوں کا استیصال کرتا ہے، اسی طرح شمس رسالت بھی اپنی نورانی شعاعوں سے روح کی گندگیوں اور اس کی آلائشوں کو دور کرتا ہے، اور انسانی اخلاق کو جلا بخشتا اور گیسوئے انسانیت سنوارتا ہے۔

(۷) جس طرح آفتاب اپنی روشنی اور توانائی کے خزانے مفت لٹاتا ہے، اسی طرح آفتابِ رسالت بھی مفت ضیا باری کرتا ہے، اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا،

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا — کہہ دو کہ میں اس (دعوت و
اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ — ہدایت) پر کوئی معاوضہ طلب نہیں
کرتا، یہ تو سارے جہان کے لیے
(انعام: ۹۰) — ایک درس ہے (انعام: ۹۰)

(۸) سورج کے بغیر زندگی کا کاروبار قائم نہیں رہ سکتا، اسی کی بدولت ہماری انسانی و حیوانی ضروریات پوری ہوتی ہیں، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اسی طرح انبیائے کرام کی مقدس اور روشن سیرتوں کے بغیر نہ دنیا سے اخلاقی برائیاں دور ہو سکتی ہیں اور نہ قوموں کے فسادات مٹ سکتے ہیں، نہ بین الاقوامی مشکلات کا حل نکل سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آفتاب رسالت کے بغیر پورا عالم تپتی ہوئی بھٹی اور گرم تنور بن جائے گا جس میں سارے انسان جھلس جھلس کر ختم ہو جائیں گے، جس پر موجودہ دور کی ہلاکت آفرینیاں شاہد ہیں، جس سے پورا عالم انسانیت خطرہ میں پڑ گیا ہے، اور آج دنیا میں اخلاق و روحانیت کا کہیں وجود ہے تو ان ہی پاک سیرتوں کے طفیل ہے۔ اس لیے اگر امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے تو اسی اخلاق و کردار کے احیا میں جسکا جدید تہذیب نے خاتمہ کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دو "روشن چراغوں" میں سے کسی ایک کا فقدان بھی زندگی کو جہنم زار بنا دیتا ہے، اس لیے انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ جس شفیق و مہربان ہستی نے انسان کی تمام ضروریات کا اس قدر اہتمام فرمایا ہے، اس کی عائد کردہ شرعی و اخلاقی پابندیوں کو تسلیم اور اپنے آپ کو اس عظیم ہستی کے سپرد کر دیا جائے،

رسالت ایک مستقل رحمت ہو | جس طرح آفتاب حرارت اور روشنی کا ایک مستقل منبع ہے۔ اگرچہ وہ خدائی حکم اور ارادہ کا تابع ہے، اسی طرح رسول بھی حکم الٰہی کے ماتحت ہدایت و نور کا مستقل منبع ہے، اور اس کی حیثیت بہت سے معاملات

میں شارع کی بھی ہے، چنانچہ کتاب اللہ کے بعد اسی کی طرح رسول کے احکام
و ہدایات یعنی حدیث و سنت واجب العمل ہیں، وہ جو کچھ کہتا ہے خدا ہی کی طرف
سے کہتا ہے، وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔

اس کے علاوہ "سراجاً منیرا" کی تشبیہ کے بعض اور اسباب بھی ہیں،

آپ ایک مکمل دین و شریعت یعنی گذشتہ مذاہب میں جو چیزیں تشنہ رہ گئی
تھیں یا جنکی اس زمانہ میں ضرورت نہ تھی، اسلام نے ان کو مکمل شکل میں پیش کیا،
چنانچہ وہ انسانی زندگی کا مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس سے اس کا کوئی
پہلو بھی باہر نہیں ہے، یہ جامعیت اسلام کے علاوہ کسی مذہب میں نہیں ہے،

۲۔ قرآن مجید ایک کھلی ہوئی واضح کتاب ہے، جس میں کوئی غموض و پیچیدگی
نہیں، اس کے متن کی شرح اور اجمال کی تفصیل یا خود قرآن کی آیات سے ہوجاتی
ہے یا سنت رسول سے،

۳۔ جس طرح آفتاب غروب ہوجانے کے بعد بھی اس کی روشنی چاند
کے ذریعہ منعکس ہوکر کائنات کو روشن کرتی رہتی ہے، اسی طرح رسول کے بعد
آپ کے صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمۂ اسلام کے ذریعہ اخلاق و روحانیت
کی کائنات منور ہوتی رہتی ہے، اور ہمیشہ ہوتی رہے گی،

سیاست میں اسلام

(۵)

مترجمہ حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

تیونس

۱۹۵۶ء میں پروفیسر ہشام شرابی نے پیشنگوئی کی تھی کہ مغربی نظریات
اور اسلامی روایات کے تضاد کو حل کرنے میں تیونس تمام عرب ممالک پر
سبقت لے جائے گا، اس پیشنگوئی کا باعث وہ قانونی اصلاحات تھیں جنھیں
بورقیبہ نے آزادی کے چند ہی مہینوں بعد ۱۹۵۶ء میں نافذ کیا تھا، یہ اصلاحات
تعدد ازدواج پر پابندی اور شادی کی عمر بڑھا کر لڑکیوں کے لیے پندرہ اور
اور لڑکوں کے لیے اٹھارہ برس کرنے سے متعلق تھیں، (۱۹۶۴ء میں یہ عمریں
اور بڑھا کر علی الترتیب سترہ اور بیس کردی گئیں) طلاق کے قانون کو
سخت تر بنادیا گیا، اس نئی حکومت کے ابتدائی دور میں کچھ اور بھی اہم تبدیلیاں
کی گئیں، مثلاً بیرونی ممالک میں رہنے والے باشندوں کی جائدادیں بحق حکومت
ضبط کرلی گئیں، اور تمام مسلم اور یہودی مذہبی عدالتوں کا خاتمہ کردیا گیا،
ان اقدامات میں حکومت نے شریعت کا احترام بہر حال ملحوظ رکھا، اس سے

روح اسلام کے خلاف جانے کا کوئی عندیہ ظاہر نہ ہوتا تھا، اسی لیے ۱۹۵۶ء میں
یہ امید قائم ہوئی تھی کہ تیونیسیائی قائدین اسلام کی مکمل تجدید پیروی کا بیڑا اٹھائیں گے
اور زمانہ کے حالات کے ساتھ اسلام کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے،

۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۰ء کی تعلیمی اصلاحات نے ان توقعات کو اور قوی کر دیا،
زیتونہ مسجد سے ملحق یونیورسٹی جو بڑی عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی، دینی تعلیم کیلئے
تیونس کی جدید یونیورسٹی کا اہم حصہ سمجھی جانے لگی، اس کے نصاب میں اسلامی
تعلیمات کے علاوہ دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ، تاریخ، جغرافیہ، جدید زبانیں،
عمرانیات، معاشیات کے مضامین بھی شامل تھے، یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو
سرکاری اسکولوں میں دینی امور کی تدریس کے لیے مقرر کیا جاتا تھا، محکمہ تعلیمات
نے ایک حکم جاری کیا کہ دینی تعلیم کے درجات میں ایسا روحانی ماحول ہونا چاہیے جو
طلبہ کو مذہب کی اہمیت و کردار سے صحیح طور پر واقف کرا سکے، اور اساتذہ کو
اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ حفظ کے طلبہ کلام مجید کے مفہوم کو پوری طرح سمجھکر
حفظ کریں، اس کے اساتذہ کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ طلبہ میں قرآن کی محبت و چاشنی
پیدا کریں اور مذہبی رسوم میں غیر ضروری نمائش کے خطرات سے واقف ہوں،
انھیں بتانا چاہیے کہ عبادت ہی وہ ذریعہ ہے جس سے کسی شخص کی انفرادیت
سماج میں مکمل ہوتی ہے، مذہبی معاملات میں بحث و مناظرہ سے دور رہنا چاہئے،
تمام بنی نوع انسان کے لیے اخوت و رواداری کا جذبہ فروغ دینا چاہیے،

حالیہ چند برسوں میں زبردست سماجی اور معاشی انقلابات نے تیونس
کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، اس دوران میں کچھ مزید مذہبی تبدیلیاں نافذ کی گئیں

صدر بورقیبہ روایتی لباس خصوصاً برقعہ سے سخت بیزار تھے، انھوں نے یہ بھی
کہا کہ رمضان کا احترام تو کرنا چاہئے لیکن اسے کسی پر اس طرح مسلط نہ کرنا چاہئے
جس سے دوسرے فرائض کی انجام دہی متاثر ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ
روزہ نہ رکھنے کا بہانہ ڈھونڈھتے تھے، انھیں اب آزادی حاصل ہو گئی، بورقیبہ
نے یہ بھی کہا کہ جس میں قربانی کرنے کی استطاعت نہ ہو اس کے لیے عید اضحیٰ کے
موقعہ پر قربانی ضروری نہیں، بقرعید میں جو اسراف اور نمائش ہوتی تھی ملکی
اخبارات نے اس پر بھی شدید نکتہ چینی کی، تیونس کے محدود زر مبادلہ کو بچانے کیلئے
بورقیبہ نے عازمین حج کو مشورہ دیا کہ وہ کسی مقامی بزرگ بالخصوص قیروان میں صحابہ
کے مزارات کی زیارت کر لیا کریں، شروع شروع میں بزرگوں کی یادگار میں ہونے
والی تقریبات کو حکومت معاندانہ نظر سے دیکھتی رہی، مگر بعد میں رواداری برتنا
شروع کر دی، سرکاری طور پر صوفیانہ نظریات کی حوصلہ شکنی لیکن بیرونی سیاحوں
کی دلچسپی کے لیے رقص و سرود کی تقریبات کی ہمت افزائی کیجاتی ہے، اور اسکے
جواز میں یہ دلیل پیش کیجاتی ہے کہ قوم کا فنون لطیفہ کا سرمایہ ضائع نہ ہونے پائے،
۱۹۶۵ء میں حکومت نے سرکاری کاموں میں مذہبی تاریخوں کا استعمال منسوخ کر دیا
اور رفتہ رفتہ قوم کی مذہبی زندگی ارباب حکومت اور سیاسی پارٹیوں کے
کنٹرول میں آتی گئی،

اب دینی تعلیم کے لیے پرائمری اور ثانوی درجات تک تیونیسی مصنفین نے نئی
درسی کتابیں تیار کی ہیں، امام کا منصب ۶۶ء ہی میں ختم کر دیا گیا تھا، اب وہ
سرکاری ملازم کی حیثیت سے سکریٹری کے ماتحت مخصوص قانونی حیثیت رکھتے ہیں

اور اب انھیں امام کے بجائے واعظ کہا جاتا ہے۔ ان کے فرائض میں عبادتوں کا اہتمام اور مسجدوں کا انتظام ہے، قومی بہبود کے موضوعات پر تقریریں کرنا اور قومی تعلیم و ثقافتی امور کے سکریٹریوں کی دیکھ بھال بھی ان کے فرائض میں ہے۔ حال ہی میں بہت سی نئی مسجدیں تعمیر کی گئی ہیں، صدر بورقیبہ کا خیال ہے کہ ان مسجدوں کو اجتماعی مرکز کی حیثیت سے استعمال کیا جائے اور قومی بہبود سے متعلق سارے کاموں میں لوگ مسجد میں جمع ہوا کریں،

موجودہ برسر اقتدار پارٹی اپنے اصولوں کو دستوری سوشلزم کا نام دیتی ہے، مگر اسی کے ساتھ اخلاقی قدروں کی حمایت کی بھی دعویدار ہے۔ ان اصولوں کے علمبرداروں نے ایک خاص نظریہ کو جنم دیا ہے، جسے وہ اسلام کے نام پر نافذ کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ اسلام کو اس کا صحیح مقام حاصل ہو سکے گا، ہر اعتدال پسند اور ذی شعور انسان کی زندگی میں سب سے ضروری چیز اس کے ضمیر کا اخلاقی احساس ہے۔ اس احساس ہی کے ذریعہ وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے، ۱۹۶۴ء میں بمقام مہدیہ ایک مذہبی تقریب میں صدر بورقیبہ نے اپنے عقیدہ کی تشریح ان الفاظ میں کی تھی :-

"میں تمام عمر اس کا قائل رہا ہوں کہ روحانیت کو مادہ پرستی پر فوقیت ہونی چاہیے، میرا یہ عقیدہ ہے کہ حق یقیناً فتحیاب ہوتا ہے، اور انسان اپنی روح کی گہرائیوں سے موجودہ کو آیندہ (آخرت) کے لیے قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور شر کے مقابلہ میں ہمیشہ خیر میں اپنے کو جذب کرنا چاہتا ہے وہ روحانی قدروں کو اپنا رہنما بناتا ہے، کیونکہ یہی چیز دنیا میں اس کی عزت

اور آخرت میں نجات کا وسیلہ بنتی ہے"

ہم نے پروفیسر شربی کی جس پیشین گوئی کا اوپر حوالہ دیا ہے، اس کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تیونس نے ۱۹۵۶ء میں اسلام اور مغربی تجدد کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کا جو دعوی کیا تھا، اسے کسی حد تک پورا بھی کیا ہے، اس سوال کا جواب یقینی طور پر نفی میں ہے، جیساکہ درج ذیل اسباب سے ظاہر ہے،

۱۔ ترکی کی طرح تیونس بھی کسی نہ کسی طور پر دنیائے عرب سے اپنے رشتے منقطع کر چکا ہے، اور مذہب سے اب اس کا کوئی خاص تعلق باقی نہیں ہے، عرب دنیا کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے اسلامی خیالات کا تیونس میں داخلہ بہت ہی محدود ہے، اور اگرچہ تعلیم میں عربی طرز کو اعتدال پسندی کے ساتھ اپنایا جا رہا ہے، لیکن تیونیسی عوام اپنی ذہنی جلا کے لیے یورپ ہی کی طرف دیکھتے ہیں، بورقیبہ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ ان کے ملک کا مستقبل یورپ سے وابستہ ہے،

۲۔ موجودہ دور میں تیونس میں کوئی عظیم دینی مفکر پیدا نہیں ہوا، جو اسلام کو ایسے رنگ میں پیش کرتا جس سے غربت کے خلاف جد وجہد کو جاری رکھا جا سکتا، اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی عقائد کو بھی تقویت پہنچی۔

۳۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ "دستورین سوشلسٹ پارٹی" نے مذہب کو اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے، اور اس سے اس کا مقصد دینی فروغ نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ سے عوام کو موجودہ حکومت کے نظریات سے ہم آہنگ کرنا ہے، اصلی اسلام اگرچہ غیر تغیر پسند ہے، لیکن آج بھی قومی شیرازہ بندی کا اصل ذریعہ بنی ہے۔

اس لیے حکمراں جماعت کے ارکان متفکر ہیں کہ کس طرح مذہب کی اصل روح کو برقرار رکھکر اس کو خطرات سے بچایا جائے، اور دور جدید میں اسے کس حد تک ترقی یافتہ بنایا جائے کہ وہ قوم کی ترقی میں مدد معاون ثابت ہو سکے، اس لیے ان لیڈروں کی نظر اسلام کو ایک منفی قوت کے طور پر استعمال کرنے پر ہے، وہ اس نئے اسلام کی کوئی واضح تشریح بھی نہیں کرتے، جس سے لوگوں میں تجدد کا جذبہ فروغ پا سکے، یہاں ہمیں مغربی مفکر آرنالڈ ہینٹنگر کی دوربینی کا قائل ہونا پڑتا ہے، وہ کہتا ہے:-

"مذہب کا صحیح استعمال ایک ایسی طاقت ہے جو آگے بڑھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، کوئی بھی مذہب منفی قوت نہیں ہو سکتا اگر وہ بحیثیت ایک مذہب کے اپنی طاقت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔"

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تیونیسی عوام کے موجودہ مذہبی رجحانات کا یہ تجزیہ محض عارضی اور وقتی ہے، ہو سکتا ہے کہ آج کا دور جس میں مختلف عناصر کارفرما ہیں اور سماجی ڈھانچہ کو سدھارنے کے لیے لوگ آگے بڑھ رہے ہیں، اسی دور میں سے انجام کار مسلمانوں کے عقیدہ کی ایک نئی تشریح یا ایک نیا رخ جنم لے لے۔

تیونس نئے افکار کی سرزمین ضرور ہے، لیکن یہ افکار کسی ذہنی خلل کا نتیجہ نہیں ہیں تیونس کی موجودہ تاریخ عاقبت اندیش اور بامقصد تغیرات کی حامل ہے، حال ہی میں ایک نوجوان تیونیسی عالم نے یہ اعلان کیا ہے کہ عالم اسلام کی ایک نئی حکومت قائم کی جائے، جس کے ہاتھ میں صرف دینی اور روحانی طاقت ہو، اس اعلان کو اخبارات اور ٹیلی ویژن پر جس قدر شوق سے پڑھا اور سنا گیا اس سے عوام کے رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسی عالم نے یہ بھی کہا کہ اسلام کے انداز فکر و عمل پر

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایسی مہر لگ گئی تھی کہ ان کی مزید تشریح نہیں کی جا سکی، لہذا ان کو ناقابل تغیر سمجھنا چاہیے۔ اور اسلام کے قدیم اصولوں کو موجودہ تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بنانے کی ضرورت ہے،

تیونس اسلام میں تبدیلیاں لانے کی حامی ایک عظیم شخصیت کا وطن بھی ہے، یہ شخص پروفیسر محمد طلبی ہے، انھوں نے ۱۹۶۰ء میں بمقام برن تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ عالم اسلام کے مذہبی تغیرات سے ہمیں بہت زیادہ پرُامید نہیں ہونا چاہیے، ان کے خیال کے مطابق اسلام میں بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی بہت گنجایش ہے، لیکن اگر کوئی موثر اصلاح کرنا چاہے تو اسلام کے متبعین کو شدت کے ساتھ اس کی تقلید کرنا چاہیے، تقریر کے خاتمہ پر انھوں نے مزید کہا کہ وہ مذہب جو ہمارے اندر روحانی خلفشار نہ پیدا کر سکے یا ہم کو نئے اقدار کا متلاشی نہ بنا سکے، نئے معیارات کی طرف مائل نہ کر سکے، جو ہمیں نقطۂ عروج تک نہ پہنچا سکے کسی طرح بھی مذہب کہے جانے کے قابل نہیں،

(پادری آر ہارسٹن اسپیٹ، تیونس)

مقالہ نما

مضامینِ "الندوہ"

از سلمان شمسی ندوی

عرصہ سے خیال تھا کہ معارف کے مضامین کا مقالہ نما مرتب کرایا جائے، اگر
ابھی یہ کام شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک نوجوان ندوی فاضل سلمان شمسی نے الندوہ
کے مضامین کا مقالہ نما مرتب کر دیا، الندوہ اپنے دور کا ممتاز علمی رسالہ تھا، اس میں
اس عہد کے نامور اہل علم کے مضامین شائع ہوتے تھے، اور اس میں علمی مضامین کا بڑا
ذخیرہ ہے، اب الندوہ کی یاد بھی فراموش ہو چکی ہے، اس لیے اہل علم کے استفادہ
کے لیے اس کا مقالہ نما شائع کر دینا مناسب معلوم ہوا، میں نے عزیز موصوف سے خواہش
کی ہے وہ معارف کا مقالہ نما بھی مرتب کر دیں، امید ہو کہ وہ اس کو قبول کرینگے، "م"
جوں جوں تحقیق کا کام وسیع ہوتا جا رہا ہے، اس سے متعلق وسائل و معلومات کے
طریقۂ کار کو بھی وسعت دیجا رہی ہے، موجودہ علمی اور ادبی طریقۂ کار میں مقالہ نما
(Bibliography) کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور اسی اہمیت کے پیش نظر انگریزی
رسالوں نے بڑے اہتمام سے اس طریقہ کو اختیار کیا، اور قدیم و جدید رسائل میں شائع
ہونے والے مضامین کے مقالہ نما شائع کیے،

اردو میں سب سے پہلے اس مفید کام کی ابتدا "نوائے ادب" بمبئی نے کی جسے

بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کی تقلید ہند و پاک کے بہت سے رسالوں نے کی،
خیال ہوا کہ "الندوہ" جو اپنے وقت کا وقیع علمی رسالہ تھا، اس کے مضامین کا مقالہ نما
تیار کیا جائے، جو ہمارے محققین کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوگا، اسی اہمیت کو سامنے
رکھتے ہوئے اس کام کو شروع کیا گیا جو ہدیۂ ناظرین ہے،

الندوہ پر کئی دور گذرے اور اس کی سرپرستی بھی کئی شخصیتوں نے کی، سب سے پہلے
۱۹۰۴ء میں علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کی سرپرستی میں شائع
ہونا شروع ہوا، جس کا سلسلہ ۱۹۱۰ء تک جاری رہا، پھر کچھ وقفہ تک بند رہنے کے
بعد ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۶ء تک اکرام اللہ خاں ندوی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا، اور
دو سال کے بعد بعض حالات کی وجہ سے دوبارہ بند ہو گیا، تیسری بار فروری ۱۹۴۰ء سے
۱۹۴۲ء تک مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور مولانا عبد السلام قدوائی کی ادارت
میں شائع ہوا،

افسوس ہے کہ اس کی فائلیں پوری طرح محفوظ نہ رہ سکیں، چنانچہ اس مقالہ نما
کی تیاری میں بھی بعض پرچے نہیں مل سکے، یہ مقالہ نما کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ
فائلوں سے تیار کیا گیا ہے، محققین کی آسانی کے لیے مضامین کو پہلے موضوعات کے لحاظ
سے تقسیم کر دیا گیا ہے، تاکہ مضمون نگار کو اپنے موضوع سے متعلق مواد مل سکے، ترتیب مضمون نگار
کے نام سے حروف تہجی کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے،

مقالہ نما مندرجۂ ذیل موضوعات پر منقسم ہے،

۱۔ علمی مباحث ۲۔ تحریکیں اور درسگاہیں ۳۔ عربی مدارس کے مسائلِ تعلیم
۴۔ تنقید و تبصرہ ۵۔ سماجیات ۵۔ شخصیات ۶۔ ادبیات

۷۔ دینی مباحث ۸۔ تاریخی مباحث ۹۔ اخلاقیات ۱۰۔ علوم قدیمہ ۱۱۔ متفرقات۔

علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہما کے اکثر مضامین جو الندوہ میں شائع ہوئے تھے، کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، اس "مقالہ نما" میں ان سے بھی استفادہ کرنے میں مدد ملے گی۔

مقالہ نما تیار کرتے وقت کوشش کی گئی ہے کہ مضمون کے کسی ایسے حصہ کا اقتباس لیا جائے جس سے مرکزی خیال کا پتہ لگ سکے۔ دوسرے یہ کہ اس خیال کو خود مضمون نگار کے الفاظ میں پیش کیا جائے لیکن جہاں ایسا ممکن نہیں ہو سکا ہے، وہاں مرتب نے اپنے الفاظ کو استعمال کیا ہے، بعض مضامین کے بارہ میں صرف اس کے عنوانات سے اندازہ ہو سکتا ہے، اس لیے صرف عنوان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ مقالہ نما کتب خانہ ندوۃ العلماء کے محفوظ فائلوں پر مشتمل ہے اس لیے مجلدات کا حوالہ نمبر بھی دیدیا گیا ہے، تاکہ محققین کو استفادہ کرنے میں آسانی ہو سکے،

خدا کرے یہ سعی قابلِ قبول ہو۔ "مرتب"

علمی مباحث

(۱) اکرام اللہ خاں (ص ۳۰ - ۳۲ اپریل ۱۹۱۶ء حوالہ ۲۸۷)

"اہل یونان کے معبود اور ان کے مذہبی اوہام"۔

اہل یونان نے قوت تخیل کی بلند پروازی سے ہر معبود کے لیے خاص خاص صورتیں فرض کر لی تھیں، ان کے لیے حسن و جمال بھی تسلیم کیا جاتا تھا، اور یہ خیال تھا کہ وہ نہایت خوبصورت اور انسانی حسن و جمال کا مظہر ہوتے ہیں، ان کے معبود مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی، آخر الذکر کو نسوانی حسن و جمال کا بہترین نمونہ فرض کیا جاتا تھا،

(۲) ص ۲۷ - ۳۲ - جنوری ۱۹۱۵ء، حوالہ ۲۸۵

"ایام جاہلیت میں کس سنہ کا رواج تھا"

اس کی تحقیق کی گئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں کوئی سنہ رائج تھا یا نہیں، اور تھا تو کونسا سنہ تھا، آخر میں جاہلیت کے جداول بھی دیے گئے ہیں،

(۳) ص ۱ - ۱۱ - اگست ۱۹۱۵ء، حوالہ ۲۸۵

"سکہ کا رواج اور اس کی تدریجی تاریخ، مختلف ملکوں کے سکوں پر محققانہ مقالہ،

سکہ کے متعلق تاریخی تحقیقات کے لیے سب سے پہلے چین کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ چین عہد گذشتہ میں تمدن و شائستگی کا سرچشمہ اور معارف و صنائع کا مرکز رہ چکا ہے، اور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تاریخ عالم میں نہایت ممتاز درجہ رکھتا ہے، چین میں ایسے سکوں کا پتہ چلا ہے جن میں سنہ مسیحی سے دو ہزار دو سو پچاس پہلے کی ضرب موجود ہے،

(۴) ص ۲ - ۸ - جولائی ۱۹۱۶ء - حوالہ ۲۸۶

فن تحریر اور تصنیف کی تدریجی ترقی کا محققانہ جائزہ۔

یہ عجیب بات ہے کہ فن کتابت نے ہماری تاریخ اور قومی روایات کو محفوظ رکھکر ہمارے ہاتھوں تک پہنچایا ہے، لیکن خود کتابت کی تاریخ آجتک نہیں معلوم ہو سکی، اور یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کتابت نے سب سے پہلے کس قوم اور کس سنہ میں رواج پایا، کیونکہ اکثر قومیں اس فضیلت کو اپنی طرف منسوب کرتی ہیں،

(۵) ص ۱۷ - ۲۶ - ستمبر ۱۹۱۴ء - حوالہ ۲۸۴/۱

"فن تصویر اور مسلمان"، اس میں تصویر کی تاریخ، قدیم قوموں میں اس کے رواج

اور مسلمانوں میں اس کی ترقی پر بحث کی گئی ہے، اسلام میں تصویر کشی حرام ہے، اس لیے مسلمانوں نے اگرچہ مستقل فنِ تصویر کی طرف توجہ نہیں کی تاہم آثارِ قدیمہ کے مطالعہ اور تفحص و تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس فن سے بیگانہ نہ تھے، .... چنانچہ انھوں نے اپنے عروج و ترقی کے زمانہ میں بغداد، قُرطبہ، طلیطلہ، غرناطہ اور اشبیلیہ میں حیوانات کی مورتیں اور سواروں کے اسٹیچو جابجا نصب کیے تھے .... اگرچہ قدیم زمانہ کی نادر طبی تحقیقات موجود نہیں ہیں لیکن گمان غالب ہے کہ مسلمانوں نے جب یونانی و فارسی طبی کتابوں کا ترجمہ کیا تو بعض اعضائے انسانی کی تصویریں بھی دیں،

انصاری، محمد اقبال وارث ندوی :-

(۱) "افلاطون کا نظریۂ تعلیم" (ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ، محرم ۱۳۶۱ھ، ربیع الاول ۱۳۶۱ھ) حوالہ ۲۸۰/۲

انور محمد صاحب ندوی :-

(۱) "کتب خانہ ندوۃ العلماء کے مخطوطات" (ص ۲۸-۳۱، اپریل ۱۹۴۲ء، حوالہ ۲۸۰/۱)

کتب خانہ ندوۃ العلماء کے چند اہم مخطوطات کا تعارف و تذکرہ۔

اویس محمد ندوی صاحب (مولانا) : (ص ۷-۱۵، جون ۱۹۴۲ء، حوالہ ۲۸۶)

(۱) "منطق استقرائی اور مسلمان"

اس وقت جبکہ یورپ اپنے لیے ایک خاص نظام استدلال کی تلاش میں ہر طرف تشنہ لب دوڑ رہا تھا، ٹھیک اسی وقت مسلمانوں کے یہاں علم و فضل کے دریا لہریں لے رہے تھے، ہر چیز عقل و فہم کی روشنی میں دیکھی جا رہی تھی، ہر بات دلیل کی ترازو میں تولی جاتی تھی، اور اصول و قانون میں قیاس کے ماتحت استقراء کا مکمل نظام تیار ہو چکا تھا جس کا خود محققینِ یورپ کو .... اعتراف ہے۔

پی نیرا :-

"جدید علم فلک کا ایک صفحہ" (ص ۱۶ - ۳۰، مئی ۱۹۱۵ء)
آفتاب اور سیارات - عمل اور ردِ عمل } (حوالہ ع ۳۸۵)

زمین مع اپنے گرد چکر کرنے والے آفتاب کے تمام کائنات کا مرکز ہے، یہ مقبول خیال عام صرف علمائے طبیعیات و فلکیات کی مسلسل کوششوں سے مغلوب ہوا ہے، مگر اس سلسلہ میں جو یادگار مباحث ہوئے ہیں، اس وقت ہم اس پر تبصرہ نہیں کریں گے، بلکہ صرف ان کے نتائج قلمبند کریں گے :

زینبی سید علی (مولانا) (جولائی تا دسمبر ۱۹۱۴ء - حوالہ ر ۲۸۴/۱)

۱- "فن بلاغت" :-

فن بلاغت کی مکمل تاریخ، اس کی تدریجی ترقی، عربیت میں اس کا مقام، اسکے مشہور اہلِ کمال، ان کی مشہور تصنیفات اور فن بلاغت سے متعلق مباحث کا تذکرہ۔

سلیمان ندوی سید (علامہ) : (شمارہ ارچ ۱۹۰۹ء تا ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ، حوالہ ۲۷۹/۴)

۱- "اسلامی رصد خانے"۔ مسلمانوں کے قائم کردہ رصد خانوں کی تاریخ۔

اسلامی رصد خانوں کی تاریخ سخت تاریکی میں ہے،" "دائرۃ المعارف" کو چھوڑ کر خود انہوں (ابن خلدون) کو بھی ان کی واقفیت نہیں، اس لیے ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے،" سب سے قدیم رصد خانہ جس کا تاریخ میں ذکر ہے، متون کا رصد خانہ ہے، جو ۴۳۲ برس قبل حضرت مسیحؑ قائم کیا گیا تھا، اسی رصد خانہ میں سب سے پہلے مدار شمسی کی تعیین کی گئی، اور اس آلہ کا استعمال ہوا جس کو قائمہ "ہیلیو میٹر" کہتے ہیں، اس کے بعد تیموخارس، منالاوس، ابرخس نے رصد خانے قائم کیے، لیکن مسلمانوں سے پہلے سب سے مشہور

اسکندریہ کا وہ رصد خانہ ہے جس کا مہتمم بطلیموس تھا،

(۲) "اوس وخزرج" (ص ۲-۷۔ شمارہ اگست ۱۹۱۶ء - حوالہ ۲۷۶)

اوس وخزرج عرب کے دو مشہور قبیلوں کے نام ہیں، جو اسلام کے پہلے سے مدینہ میں سکونت پذیر تھے، اسلام آیا تو وہ اس کے پرزور دست وبازو بن گئے، انصار ان کا لقب تھا، عام طور سے ان کو بھی قحطانی الاصل اور کہلان کا ایک خاندان قرار دیا گیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ رائے بھی صحت سے تہی ایہ ہے، زبان، مذہب اور اخلاق قومی کے علاوہ روایات سے بھی ان کے اسمٰعیلی ہونے پر مستحکم دلائل ہیں،

(۳) "شیراز ہند پورب" شمارہ فروری، مارچ، اپریل، مئی ۱۹۲۱ء - حوالہ ۲۸۰/۲)
"شرقی ہند کی علمی تاریخ کا جائزہ" - "حیات شبلی کے بعض حصے"

(۴) "طبقات الارض اور مسلمان" (ص ۱۷-۲۳ شمارہ اکتوبر ۱۹۰۷ء، حوالہ ۲۷۹/۴)

طبقات الارض (جیالوجی) وہ علم ہے، جس میں زمین کی تاریخ، پیدائش، ترکیب، شکل خواص، طبقات اور پہاڑوں کی پیدائش سے بحث کی جاتی ہے، اس مضمون میں طبقات الارض کے ایک خاص مسئلہ یعنی زمین اور پہاڑ کی پیدائش پر بحث ہے، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ مسلمان طبقات الارض کے مبادی سے واقف تھے، اور اس عام خیال کی تردید ہوگی کہ مسلمان طبقات الارض سے واقف نہ تھے،

(۵) "عربیت اور ہندوستان" یعنی ہندوستان میں عربیت کی تاریخ۔

(شمارہ ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۳۲۲ھ حوالہ ۲۷۹/۱)

ہندوستان کی چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے علماء ومشائخ کے تذکرے پڑھنے اور ان کی اجازات وسندات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ فن ادب سے بھی

آلال تھے، حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا قدس سرہ العزیز نے، اپنے زمانہ طالب علمی میں تمام مقامات حریری از بر کر لیے تھے، حضرت بدرالدین اسحاق خلیفہ وداماد حضرت فریدالدین گنج شکر قدس سرہما نے ایک کتاب علم الصرف میں "تصریف بدری" نامی لکھی تھی، اس کے آخر میں بطور خاتمہ نثر ونظم میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان پر پورا قابو رکھتے تھے،

(۶) "علم ہیئت اور مسلمان": (شمارہ اپریل ۱۹۰۷ء واگست ۱۹۰۷ء - حوالہ ۳۷۹/۴)

دنیا کے تمام علوم وفنون کا وجود مدبرین عالم کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ ہے، صرف علم ہیئت اپنے وجود میں ایشیا کے صحرانشین چرواہوں کا ممنونِ احسان ہے، جو ایشیا کے کھلے میدانوں میں اپنی پُرمصیبت راتیں اختر شماری میں بسر کرتے اور بے شغلی سے گھبرا کر صفحۂ افلاک کا مطالعہ شروع کر دیتے تھے، اس غور ومطالعہ سے ان کو ستاروں کی ہر سطر میں یہ عبارت آنے لگی کہ اس دائرۂ افلاک کا ہر نقطہ کوکب ایک مستحکم قانون کی سطح پر ساکن ہے یا حرکت کرتا ہے، کواکب کا سکون وحرکت ہماری زراعت پر خاص اثر کرتی ہے، ان ستاروں کا تغیر وتبدل کسی خاص اصول پر ہے،

(۷) مدین: (شمارہ مارچ ۱۹۱۵ء، ص ۳-۲۰، حوالہ ۲۸۵)

نسل ابراہیمی کا سرخیل مدین تھا جس نے اپنے بھائی اسماعیل کے قریب مدین نامی آبادی قائم کی، یہ مدین شمالی مغربی عرب میں جزیرہ سینا کے متصل طولاً خلیج عقبہ "عیلا" کے سواحل پر از دہانہ خلیج تا حد ساحل بحراحمر وار ثمود وحجاز جہاں ثمود وجرہم وعرب اسماعیل آباد تھے، واقع تھا،

(۸) "مستشرقین یورپ"، قدیم مستشرقین کا تعارف اور ان کی علمی خدمات کا جائزہ،
(شمارہ جولائی تا نومبر ۱۹۱۱ء - حوالہ ۲۷۹/۶)

مستشرقین یورپ نے اسلام اور عربیت پر جو بے انتہا احسانات کیے ہیں ان کے
شکریہ کا بار گراں چند مختصر مضامین سے نہیں ہو سکتا، ذیل کے چند مسلسل نمبروں میں ان کے
احسانات کے اعتراف میں ان کے کارناموں کا مفصل ذکر کیا گیا ہے، اس مضمون کا ماخذ
"الآداب العربیۃ فی القرن التاسع عشر" ہے

شبلی نعمانی علامہ:-

(۱) بھاشا زبان اور مسلمان: ص ۱-۱۲، شمارہ اکتوبر ۱۹۰۶ء، حوالہ ۲۷۹/۳

اس مضمون میں دکھایا گیا ہے کہ ترجمہ اور اشاعت کے علاوہ مسلمانوں نے خود بھاشا
زبان میں کیا کیا تصنیفات کیں، اور بھاشا کی شاعری میں کس درجہ کا کمال پیدا کیا، عام طور پر
مشہور ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے بھاکا زبان میں شعر و شاعری کی وہ حضرت امیر خسرو ہیں،
لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ کا پتہ آگے تک چلتا ہے،

(۲) عربی زبان، یعنی سامانی زبانوں کی خصوصیات اور عربی، سریانی اور عبرانی کی
قدامت پر مختصر بحث: (شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ، حوالہ ۲۷۹/۱ ص ۲۴-۲۷)

دنیا میں یوں تو سیکڑوں ہزاروں زبانیں مروج اور مستعمل ہیں، لیکن سب کی اصل الاصول
صرف تین زبانیں ہیں، ایک سامی جو سام بن نوح کی طرف منسوب ہے، اس زبان سے جو زبانیں پیدا
ہوئیں وہ عربی، عبرانی، سریانی، کلدانی، نبطی وغیرہ ہیں،

(۳) "علوم جدیدہ" - قدیم و جدید کو سامنے رکھکر علم کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے۔
(شمارہ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ، ص ۳۸-۴۲ - حوالہ ۲۷۹/۱)

علوم جدیدہ کے مسائل بعض ایسے ہیں جو پہلے بھی موجود تھے، لیکن آج انکی تشریح جس طرح
کیجاتی ہے اگلوں نے نہیں کی تھی، اس سلسلہ کی ابتدا اسی قسم کے ایک مسئلہ سے کیجاتی ہے، کیونکہ اس

قدیم و جدید کے موازنہ کا موقع بخوبی مل سکتا ہے۔

(۴) عمر خیام کا جبر و مقابلہ۔ (ستمبر ۱۹۰۹ء، ص ۵-۷، حوالہ ۲۷۹/۹)

عمر خیام کو ہم جس حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں وہ یہی کہ وہ شاعر ہے، رباعی گو ہے، اور زیادہ سے
زیادہ یہ کہ آجکل کے مذاق کے موافق آزاد خیال ہے، تاریخوں اور تذکروں میں اسکی ریاضی دانی
کا ذکر ضرور ملتا ہے، لیکن ہمارے خیال میں وہ اس قسم کی بات تھی کہ علامہ ابن ہمام شارح ہدایہ
موسیقی بھی جانتے تھے، لیکن یورپ کی بدولت آج ہم کو عمر خیام کی وہ کتاب ہاتھ آئی جس سے اس کے
ریاضی داں اعظم ہونے کا ثبوت ملتا ہے،

(۵) فن بلاغت، اس کے موجد مسلمان تھے۔ (رمضان ۱۳۲۲ھ ص ۲۱-۳۰ - حوالہ ۲۷۹/۱)

مسلمانوں نے جو علوم و فنون خود ایجاد کیے اور جن میں وہ کسی کے مرہون منت نہیں ہیں،
انہیں ایک یہ فن بھی ہے، عام خیال یہ ہے، اور خود ہم کو ایک مدت تک یہ گمان رہا کہ یہ فن بھی مسلمانوں نے
یونانیوں سے لیا، لیکن اب اس خیال کی غلطی علانیہ ثابت ہوگئی۔

(۶) مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی: (رمضان ۱۳۳۳ھ، ص ۱۰-۱۲، حوالہ ۲۷۹/۲)

مسلمانوں نے ہندوؤں کے علوم و فنون کو جس ذوق و شوق سے سیکھا اور ان میں جو مہارت
حاصل کی اس کو ہم نے اپنی کتاب تراجم میں تفصیل سے لکھا ہے، ...... ابو معشر فلکی نے ہندوستان
میں رہ کر جس طرح سنسکرت کے علوم و فنون حاصل کیے، البوریحان بیرونی نے سولہ برس کی مدت
میں سنسکرت میں کمال پیدا کیا اور ہندوؤں کے علوم و فنون پر مبسوط کتاب لکھی ....
یہ واقعات ہمارے ہندو دوستوں کے کانوں تک نہیں پہنچے، لیکن مسلمانوں کی علمی انجمن کے
پارینہ افسانے ہیں، اور اس لئے ہم ان کو دہرانا نہیں چاہتے۔

(باقی)

باب التقریظ والانتقاد

تفسیر ماجدی حصہ دوم

از جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۱۷، غیر مجلد ۱۵، پتہ: (۱) صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ (۲) دارالمصنفین، اعظم گڈھ (۳) کوثر ایجنسی چھتہ بازار، حیدرآباد، دکن۔

تفسیر ماجدی کے پہلے حصہ پر معارف میں ریویو ہوا تھا، اس کا دوسرا حصہ بھی جو سورۂ نساء سے لیکر سورۂ توبہ تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، عرصہ ہوا شائع ہو گیا تھا، مگر ہماری نظر سے نہیں گزرا تھا، اب اس کا دوسرا اڈیشن ریویو کیلئے آیا ہے، اس کے پہلے حصہ کے ریویو میں ہم نے اس کی خصوصیات کا ذکر کیا تھا، اس حصہ میں بھی وہی خصوصیات ہیں، ان کو سمجھنے کے لیے چند باتوں کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے،

ہر زمانہ کا ذوق اور اس کے خیالات ورجحانات، اس زمانہ کے علوم واکتشافات اور علمی وعقلی معیار کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اس لیے ہر دور کے مفسرین نے اپنی اپنی تفسیروں میں ان کا لحاظ رکھا ہے، اور ان کی روشنی میں تفسیریں لکھی ہیں، اس لیے وہ اپنے اپنے زمانہ کے ذہن ودماغ کی تشفی کے لیے بالکل کافی ہیں، اب زمانہ کا قدم بہت

آگے بڑھ گیا ہے، ہر چیز علمی وعقلی معیار سے جانچی جاتی ہے، اس لیے ایسی تفسیر کی ضرورت تھی جو اس دور کے معیار پر پوری اتر سکے اور موجودہ ذہن ودماغ کی تشفی کر سکے، چنانچہ اس زمانہ میں بعض ایسی تفسیریں لکھی گئی ہیں، ان میں مولانا ابو الکلام کے ترجمان القرآن کا مقدمہ بہت اہم ہے، گو اس میں کلام مجید کی پوری روح اور اس کی تعلیمات کا جوہر آگیا ہے، لیکن وہ صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے، باقی حصہ صرف تشریحی ترجمہ ہے، اس میں بھی کہیں کہیں مفید بحثیں آگئی ہیں، اسی نہج پر پورے کلام مجید کی تفسیر کی ضرورت تھی، اس ضرورت کو تفسیر ماجدی نے پورا کیا ہے،

کلام مجید اصلاً رشد وہدایت کا صحیفہ ہے، اس کا مقصد انسانوں کی ہدایت ورہنمائی اور ان کا اخلاقی وروحانی تزکیہ ہے، اس لیے اس کا مقصود بالذات ان سے متعلق تعلیمات اور احکام وہدایات ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی اور اسکی قدرت وربوبیت کے ثبوت کے لیے کائنات کی خلقت، اس کی حکمتوں، اس کے فوائد، اس کے بے نظیر نظام اور انسانوں کی عبرت وبصیرت کے لیے گذشتہ انبیاء ورسل اور قدیم اقوام وملل کے سبق آموز واقعات کا بکثرت ذکر ہے، اور ان پر غور وفکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، طبیعیات، حیاتیات، نباتات بہت سے علوم کی بنیادیں ملتی ہیں، مگر ان کا مقصد عبرت وبصیرت ہے، اس لیے کلام مجید کا انداز بیان علمی وفنی کے بجائے سبق آموزی کا ہے، اور صرف اسی حد تک جس حد تک اس مقصد کیلئے ضروری ہے، چنانچہ اس نے ان کا ذکر اپنے عہد کے رائج اور متعارف خیالات کے مطابق کیا ہے، مگر یہ اس کا اعجاز ہے کہ اس نے ان کی تعبیر ایسے الفاظ میں کی ہے کہ ہر زمانہ کے لوگ اپنی عقلی سطح اور اپنے دور کے علوم واکتشافات کی روشنی میں اسکی تعبیر کر سکتے ہیں اور

اس میں اور کلام مجید کے بیانات میں کوئی تعارض و تضاد نہیں پیدا ہوتا،

تفسیر ماجدی میں ان تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے، قرآنی تعلیمات کی تفسیر احادیث معتبار اور اکابر مفسرین کی تفسیروں کی روشنی میں کی گئی ہے، اور ان میں تفسیر کے مختلف پہلوؤں کے متعلق جس قدر ضروری معلومات ہیں سب کو اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، جا بجا اسلامی احکام کا دوسرے مذاہب کے احکام سے موازنہ کر کے اسلامی احکام و تعلیمات کی برتری دکھائی گئی ہے،

گذشتہ انبیاء و رسل اور قدیم اقوام و ملل کے واقعات میں اسلامی ماخذوں کے علاوہ خود انکی مذہبی اور تاریخی کتابوں اور جدید تاریخی و اثری تحقیقات سے بھی مدد لیگئی ہے اور ان سے کلام مجید کے بیانات کی تصدیق اور اسکے خلاف ان اقوام و مذاہب میں جو روایات ہیں انکی پوری تردید کی گئی ہے، اس سلسلے میں کلام مجید پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب بھی آگیا ہے، اس تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت اور اس کا امتیازی وصف یہی ہے جس کی مثال اردو کیا عربی کی تفسیروں میں بھی نہیں ملتی،

کائنات کی تخلیق اور اس کے نظام کی آیات کی تفسیر اس طرح کیگئی ہے کہ عوام و خواص دونوں کی عقل و فہم کے لیے یکساں قابل قبول ہے، اور اس میں اور جدید علوم و اکتشافات میں کوئی تعارض نہیں ہوتا، اس تفسیر میں اردو کی بعض عقلی تفسیروں کی طرح دور از کار تاویلوں سے کام نہیں لیا گیا ہے اور کوئی تفسیر بھی اسلام کی روح اور عقیدۂ سلف کے خلاف نہیں ہے، اس لحاظ سے یہ تفسیر علم و تحقیق، عقل اور روایت و درایت کے سارے پہلوؤں کی جامع اور ان سب کے معیار پر اترتی ہے، انداز بیان کی خوبی اور دلنشینی کے لیے مولانا کا نام پوری ضمانت ہے،

"م"

مطبوعات جدیدہ

فروغ اردو مولانا عبد الماجد دریابادی نمبر:۔ مرتبین جناب عبد القوی دریابادی، سید احتشام حسین، محمد حسین شمس علوی، سید امیر حسن نورانی، سعادت علی صدیقی صاحبان۔ بڑی تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۲۴، قیمت نو روپیے۔

پتہ ادارۂ فروغ اردو، ۳۷-امین آباد پارک لکھنؤ ۱

مولانا عبد الماجد دریابادی کے علمی، مذہبی و ادبی خدمات اور قلمی گلکاریوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے، خصوصاً ادب و انشا اور طنزیات کے مسلمہ امام ہیں، اور اردو و انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، یہ خاص نمبر مولانا کے گوناگوں خدمات اور کمالات کا مرقع ہے، اس میں ان کے حالات و سوانح اور علمی و دینی، ادبی و تنقیدی اور صحافتی و تصنیفی کارناموں کے متعلق کئی درجن مضامین ہیں، ملا واحدی، ظفر حسین خاں مرحوم، غلام رسول مہر مرحوم، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، پروفیسر ضیا احمد بدایونی، پروفیسر سید احتشام حسین، حضرت آوارہ اور غلام احمد فرقت کاکوروی وغیرہ ممتاز اصحاب علم و قلم نے مولانا کی شخصیت و کمالات کے مختلف جلوے دکھائے ہیں، ماہنامہ آجکل کی فرمائش پر مولانا نے اپنے خود نوشت حالات لکھے تھے، یہ دلچسپ مضمون بھی اس نمبر کی زینت ہے، نظموں کا حصہ بھی ہے لیکن بھاری بھرکم نثری مضامین کے سامنے ہلکا ہے، مولانا اور ان کے ہمعصر اکابر کے چند یادگار فوٹو بھی ہیں، جو مولانا کے موجودہ ذوق و طبیعت پر

یقیناً گراں گذرے ہوں گے، مضامین ایک سطح کے نہیں ہیں، اور نہ مولانا کی بوقلموں شخصیت اور گوناگوں کمالات کا ایک نمبر میں احاطہ ہی کیا جا سکتا ہے، تاہم اکثر مضامین معلومات افزا ہیں، اور ان سے مولانا کی سوانحعمری کی ترتیب میں آئندہ بڑی مدد ملے گی، اس عہد کے اکثر علماء و اہل قلم سے مولانا کے تعلقات رہے ہیں اور وہ خود مختلف علمی، ادبی اور مذہبی تحریکوں اور اداروں سے وابستہ رہے ہیں، اس لیے اس نمبر سے ان کے متعلق بھی یک گونہ معلومات حاصل ہوتے ہیں، مولانا کے متوسلین اور علمی و ادبی حلقوں میں ادارۂ فروغ اردو کی یہ پیشکش پذیرائی کے لائق ہے،

عالم عربی کا المیہ :- از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۸، قیمت تین روپے ۵۰ پیسے، پتہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹، لکھنؤ۔

مسلمانوں کے قبلۂ اول اور فلسطین کی ارض مقدس پر یہود کا قبضہ اور عربوں کی شکست دنیائے اسلام اور اسلامی تاریخ کا بڑا سانحہ ہے، جس سے پوری دنیائے اسلام بےچین ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو عربوں سے زیادہ لگاؤ رہا ہے، انھوں نے اکثر عرب ممالک کی سیاحت کی ہے، اور ان کے حالات و مسائل اور اداروں و تحریکوں سے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے اس المیہ پر ان کا کرب و اضطراب بھی غیر معمولی ہے، یہ کتاب اسی کرب و بےچینی کا نتیجہ اور جذبات غم کی تصویر ہے، اس میں مندرجہ ذیل سات مضامین ہیں، (۱) عالم عربی کا المیہ اور اسکے حقیقی اسباب (۲) فتح و غلبہ کے الٰہی نظام (۳) سود و زیاں کی میزان (۴) عالم عربی کو اصل خطرہ اسرائیل سے نہیں اس ضمیر سے ہے جس نے اپنا کام چھوڑ دیا (۵) المیہ فلسطین سے تین سبق، (۶) صدر ناصر کی مخالفت کیوں؟ (۷) اسلام کے حلقہ بگوش عربوں کو قرآن کی نوید فتح۔

ان مضامین میں فاضل مصنف کی دلسوزی و دردمندی، ملی و قومی حمیت اور اسلام و

مسلمانوں کی سربلندی کے جذبات نے بڑی تاثیر پیدا کر دی ہے، اس لیے یہ نالۂ و شیون کے بجائے مسلمانوں کی نشأۃ نو کا پیغام ہیں، ان میں قرآن مجید کی روشنی میں عربوں کی ہزیمت کے اسباب و عوامل کا تجزیہ اور ان کی خامیوں اور ان کے بعض حکمرانوں کے طرز عمل پر بڑی شدت سے نقد و احتساب کیا گیا ہے، ابتدا کے پانچ مضامین میں المیہ کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے، اور آخری مضمون میں یہود کی کامیابی کو عارضی بتاتے ہوئے عربوں کو فتح کا مژدہ سنایا گیا ہے، اور اس کے شرائط بتائے گئے ہیں، چھٹے مضمون کے سوا سب عربی میں تھے، مولانا کے عزیزوں اور شاگردوں نے ان کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے اس آئینہ میں پاکستان کی موجودہ شکست کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے، اور یہ ہر مسلمان کے لیے سبق آموز ہے۔

گاندھی جی اور انکے خیالات :- مرتبہ جناب عبداللطیف اعظمی صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۵۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت پانچ روپے

پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

گاندھی جی کی صد سالہ جینتی کے موقع پر رسالہ جامعہ نے ایک خاص نمبر شائع کیا تھا، جناب عبداللطیف اعظمی نے اس میں کچھ رد و بدل اور ترمیم و اضافہ کر کے یہ کتاب مرتب کی ہے، جو دس مضامین اور گاندھی جی کی چند تقریروں، تحریروں اور ایک اردو خط پر مشتمل ہے، گو یہ مضامین مختصر ہیں لیکن ونوبا بھاوے، پیارے لال، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، پروفیسر ہمایوں کبیر مرحوم، پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر سید عابد حسین وغیرہ کے قلم کے ہیں، جن کو گاندھی جی سے قربت و خصوصیت رہی ہے، پروفیسر ہمایوں کبیر کا مضمون (گاندھی جی اور انقلاب ہند) بہت مفید ہے، اس سے گاندھی جی کی سیاسی بصیرت اور انقلاب کی تعلیم و تربیت

پر روشنی پڑتی ہے، گاندھی جی کی تحریریں اور تقریریں ہندو مسلم اتحاد، عدم تشدد اور ہندوستان کی قومی زبان اور معاشی و اخلاقی ترقی کے متعلق خیالات پر مشتمل ہیں، لائق مرتب نے ان کی کتاب "تلاش حق" کی تلخیص کی ہے، اور ان کی پیدائش ۱۸۶۹ء سے ۱۹۱۵ء تک کے اور جناب کرشن کرپلانی نے اس کے بعد ۱۹۱۶ء سے وفات ۱۹۴۸ء تک کے واقعات و حالات لکھے ہیں، اس سے گاندھی جی کی شخصیت اور ان کے خط و خال کے علاوہ گذشتہ سو سالہ قومی جد و جہد کی سرگذشت اور جنگ آزادی کے مختلف مراحل کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، فاضل مرتب نے ان منتشر مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرکے ایک مفید قومی کام انجام دیا ہے۔

"ض"

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت :- دار المصنفین اعظم گڈھ

نوعیت اشاعت :- ماہانہ

نام پرنٹر :- عطاء اللہ

قومیت :- ہندوستانی

پتہ :- دار المصنفین اعظم گڈھ

نام پبلشر :- " "

قومیت :- ہندوستانی

پتہ :- دار المصنفین اعظم گڈھ

اڈیٹر :- شاہ معین الدین احمد ندوی

قومیت :- ہندوستانی

پتہ :- دار المصنفین اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ

میں عطاء اللہ تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ عطاء اللہ

جلد ۱۰۹ ۔ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۲ء ۔ عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات